ابوالکلام

تحریر وتحقیق : ڈاکٹر ساجد امجد

علم و ادب کا ایسا آفتاب جس کی روشنی نے پورے ہندوستان میں ایک نئی جگا چوند پیدا کردی تھی۔ مسلمان ھی نہیں ہندو بھی ان کے علم و فراست کے معتقد تھے۔ تحریک آزادی کے صف اول کے رھنماؤں میں وہ شامل تھے۔ انگریز حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں اور کانگریس کا ساتھ دینے پر مسلمانوں کی تنقید کا نشانہ بھی بنے مگر تمام تر سیاسی نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کا علمی و ادبی مرتبہ کبھی کم نہ ھوا۔ علامہ اقبال نے ان کے بارے میں فرمایا "تمام ھندوستان میں ایک عالم تھا جو کم و بیش مجتھدانہ حیثیت رکھنے کا اھل ھوسکتا تھا"

عالم بے بدل تحریک آزادی کے ہیرو مولانا ابوالکلام آزاد کی سرگزشت

محی الدین نے کئی ٹرنک اور صندوق برابر برابر رکھ کر فرضی ریل گاڑی بنائی اور فاتحانہ شان سے' اپنے اس کارنامے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کام میں اس کی دو بڑی بہنوں نے بھی اس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ جب ریل کے ڈبے مکمل ہوگئے تو اس نے عجیب لطیفہ کیا۔ والد کی پگڑی سر پر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ بزرگوں کی متانت اور عالمانہ سنجیدگی اس کے اردگرد پہرا دے رہی تھی لیکن اس کی بہنوں کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ چار پانچ سال کی عمر اور سر پر اتنی بڑی پگڑی۔ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ماجرا کیا ہے اور اب وہ کون سا فتویٰ جاری کرنے والا ہے۔

"تم دونوں زور زور سے کہو' ہٹو ہٹو راستہ دو۔ دہلی والے مولانا آرہے ہیں" ننھے محی الدین نے اپنی بہنوں سے کہا اور خود ایک صندوق پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اپنی دانست میں وہ ریل کے ڈبے میں سوار تھا۔

"یہاں تو ہمارے سوا کوئی نہیں۔ ہم کس سے کہیں کہ راستہ دو اور یہ دہلی والے مولانا کون ہیں؟"

"اتنا بھی نہیں جانتیں۔ مکہ معظمہ آنے سے پہلے بلکہ میرے اور تمہارے پیدا ہونے سے بھی پہلے حضرت دہلی ہی میں تو رہتے تھے" وہ سب بہن بھائی اپنے والد کو حضرت کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کیا حضرت ہو؟"

"جتنے مولانا ہیں' دہلی ہی سے تو آتے ہیں" محی الدین نے کہا "بس تم بحث میں مت الجھو۔ جلدی سے راستہ بناؤ۔ دیکھتی نہیں ہو' ریل کتنی دیر سے کھڑی ہوئی ہے۔"

بہنوں نے اس کی دل جوئی کے لیے "ہٹو ہٹو راستہ دو" کی آوازوں کے ساتھ اس طرح ہاتھ چلانے شروع کردیے جیسے لوگوں کو ادھر اُدھر ہٹا رہی ہوں۔ جب بھیڑ چھٹ چکی اور راستہ بن گیا تو محی الدین صندوق سے نیچے اترا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا پُروقار چال سے چلنے لگا جیسے واقعی کوئی بہت بڑی ہستی پلیٹ فارم پر ٹہل رہی ہو۔ بھیڑ اتنی ہو کہ چلنے کے لیے جگہ نہ مل رہی ہو۔ بڑی مشکل سے وہ ایک اونچی جگہ تک پہنچا جہاں کھڑے ہوکر اسے تقریر کرنی تھی۔

"اب تم لوگ زور زور سے تالیاں بجاؤ۔ سمجھو کہ میرے چاروں طرف ہزاروں آدمی کھڑے ہیں۔ میں تقریر کررہا ہوں اور وہ خوش ہوکر تالیاں بجا رہے ہیں۔"

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے" بہنوں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

"کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس تم لوگ تالیاں

بجاؤ۔"

"تم تقریر بھی تو کرو ورنہ ہم تالیاں کیسے بجائیں گے؟"

یہ فرمائش اس کے لیے اتنی نئی تھی کہ وہ گھبرا گیا۔ غالباً کھیل کا منصوبہ بناتے وقت تقریر کرنے کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح ہاتھ چلاتا رہا جیسے کسی پنڈال میں کھچا کھچ بھرے ہوئے لوگوں کو خاموش رہنے کے لیے کہہ رہا ہو۔

"بھئی، یہ لوگ بہت گستاخ ہیں۔ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ ہم اس وقت تقریر نہیں کرسکتے" اس نے کہا اور نیچے اتر آیا اور دوبارہ اپنی بنائی ہوئی ریل گاڑی کے ایک صندوق پر چڑھ گیا۔

"بھائی، تم بہت ہوشیار ہو۔ تقریر کرنی آتی نہیں اور بہانہ یہ کہ لوگ سننے کو تیار نہیں۔"

"اب دہلی والے مولانا کو نیند آرہی ہے" اس نے کہا اور اسی صندوق پر لیٹ گیا۔

کھیل ختم پیسہ ہضم۔ ٹرنک اور صندوق اپنی اپنی جگہ ترتیب سے رکھ دیے گئے۔ محی الدین نے اپنے سر سے پگڑی اتاری اور حفاظت سے اسی جگہ رکھ آیا جہاں سے اٹھائی تھی۔

محی الدین کو اب واقعی نیند آنے لگی تھی۔ اس کے والد مولانا خیرالدین عصر کی نماز کے لیے اٹھنے ہی والے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے کھیلتے ہوئے دیکھ لیں۔ وہ چپکے چپکے چلتا ہوا گیا اور ماں کے پاس جاکر لیٹ گیا۔ وہ سخت رنجیدہ تھا۔ سونے کے لیے لیٹ ضرور گیا تھا لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا، حضرت تو حرم شریف میں وعظ کرتے ہیں۔ اتنی لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں لیکن ایک میں ہوں کہ بہنوں کی فرمائش پر بھی تقریر نہ کرسکا۔ اسے شدت سے اپنی توہین کا احساس ہورہا تھا۔ ابھی اس کی آنکھوں میں نیند نے پہلی کروٹ لی تھی کہ ماں نے اسے اٹھادیا۔

"چلو اٹھو، نماز کا وقت ہوگیا۔"

وہ پہلی آواز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی بہنیں اور بھائی ابو نصر مسئلے پر بیٹھ چکے تھے اور ماں کا انتظار تھا۔ محی الدین اور اس کا بھائی ابھی کم سن تھے اس لیے صرف جمعہ پڑھنے مسجد جاتے تھے۔ باقی نمازیں گھر پر ادا کرنے کا حکم تھا اور سختی سے پابندی کرائی جاتی تھی۔ اس نے ماں کے ساتھ مل کر وضو کیا اور ان کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

مولانا خیرالدین نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد گھر پہنچے تو مردانے ہی میں ٹھہر گئے۔ اس وقت وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ان کے عقیدت مند اور مرید بھی تھے۔ یہی روز کا معمول تھا اور یہ معمول بھی تھا کہ محی الدین اور اس کے بھائی کو مردانے میں جاکر بیٹھنا ہوتا تھا۔ دونوں بھائی نہایت ادب سے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں مولانا خیرالدین کے عقیدت مند مؤدب بیٹھے تھے۔ جیسے ہی وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے، تمام مریدین ان کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ دو ایک نے اٹھ کر ان کے ہاتھ بھی چومے۔ کچھ دیر کے لیے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ حاضرین اپنے اپنے مسائل بیان کررہے تھے اور مولانا خیرالدین ان مسائل کے جوابات دے رہے تھے۔ محی الدین اپنے والد کی طرف رشک سے دیکھ رہا تھا۔ یہ قوتِ بیان مجھ میں کیوں نہیں ہے۔ علم کا یہ خزانہ مجھے کب نصیب ہوگا۔ وہ ان سوالوں پر ہمیشہ غور کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اسی سوچ میں گم، نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ مقدس محفل مغرب کی اذان تک جاری رہی۔

مغرب کی نماز کے بعد مکے کے چند شریف خاندانوں کی خواتین اس کی والدہ کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ یہ بھی روز کا معمول تھا۔ اس کی والدہ بھی نہایت فصیح البیان تھیں۔ عورتیں جمع ہوجاتیں تو بلند آواز سے ان کے سامنے کچھ نہ کچھ بیان کرتیں۔ کبھی کوئی خاص کتاب، کبھی کوئی مفید مذہبی قصہ، کبھی کسی مذہبی مسئلے کا بیان۔ یہ عورتیں بھی اسی عقیدت سے بیٹھتیں جس کا مظاہرہ وہ مردانے میں دیکھا کرتا تھا۔

اس کی والدہ کا خاندان، حجاز کے نہایت سربلند علوی خاندانوں میں سے تھا اور ان کے والد اور چچا کی عزت حرمین کے تمام عالموں کے دلوں پر نقش تھی اس لیے یہ عورتیں بھی ان کی حد درجہ تعظیم کرتی تھیں۔

محی الدین عزت و تکریم کے یہی مناظر دیکھ دیکھ کر عمر کی سیڑھیاں طے کررہا تھا۔ ذہنی طور پر اپنی عمر سے آگے چل رہا تھا اس لیے اس فضا کا اثر بھی سب سے زیادہ اسی پر تھا۔ وہ بھی چاہتا تھا، بہت سے سننے والے ہوں اور وہ ان کے درمیان کسی بلند جگہ پر کھڑے ہوکر تقریر کرے۔ ایک دن شدتِ شوق سے مجبور ہوکر اس نے اپنے کھیل کو ایک نیا رخ دے دیا۔ آج دہلی والے مولانا اپنے مریدوں سے خطاب کریں گے۔ اس نے اعلان کیا اور ایک کرسی پر کھڑا ہوگیا۔ تینوں بہنیں اس کے سامنے تھیں لیکن اس کے تصور میں خدا کی خلقت پرے جمائے کھڑی تھی۔ اس نے نصیحت کی وہی

باتیں بیان کرنی شروع کردیں جو وہ اپنی والدہ اور والد سے بارہا سن چکا تھا اور اس کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ بہنیں کچھ دیر تو اس ننھے مقرر کی حرکات و سکنات کو دیکھ دیکھ کر ہنستی رہیں لیکن پھر اچانک سنجیدہ ہوگئیں۔ اس گھر میں عربی زبان ہی گفتگو کا ذریعہ تھی لیکن اس وقت جیسی شستہ عربی وہ بول رہا تھا، وہ تعجب خیز تھی۔ باتوں پر غور کیا تو وہ بھی بے ربط نہیں تھیں۔ پانچ سال کے بچے میں کوئی بڑی روح داخل ہوگئی تھی۔

یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن خلافِ عقل نہیں تھا بلکہ ایسا نہ ہوتا تو تعجب خیز تھا۔ یہ سحر انگیز کیفیت خاندانی وراثت کا اعجاز تھی۔ اس کے خاندان میں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ تین مختلف سرچشموں کا فیضان تھا۔ اس کے جدِ امجد مولانا محمد ہادی دہلی کے مشہور خاندان علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ والد ماجد کے نانا مولانا منورالدین تھے جن کا شمار اپنے عہد کے مشاہیر اساتذہ اور اصحابِ طریقت میں کیا جاتا تھا۔ مولانا منور الدین کے والد مولانا رشید الدین صوبہ لاہور کے قاضی القضاۃ اور احمد شاہ ابدالی کی جانب سے گورنر پنجاب کے مشیر تھے۔

مولانا منورالدین کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ پوری قاموس، تمام کتب درسیہ اور ان کے حواشی اس طرح ازبر تھے کہ ان کے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ اگر یہ کتابیں گم ہوگئیں تو یہ اپنے حافظے سے پھر لکھ کردے سکتے ہیں۔ خود مولانا خیرالدین کے علمی مرتبے کا حال یہ تھا کہ حرم شریف میں درس دینے کی اجازت خاص حاصل ہوئی تھی۔ یہ اعزاز ان سے پہلے کسی ہندوستانی عالم کو نہیں ملا تھا۔

اس کی والدہ حضرت شیخ محمد بن ظاہر ...وتری کی بھانجی تھیں جو مدینہ منورہ کے مفتی تھے۔ وہ تمام امور دینیہ سے اس حد تک واقف تھیں کہ عورتوں کو درس دیا کرتی تھیں۔ نہایت پُرگو اور فصیح البیان تھیں۔

یہ خانہ ہمہ آفتاب تھا۔ روشنی کے جتنے دریچے تھے، سب اس کی طرف کھل گئے تھے۔ اس ماحول میں محی الدین کی قبل از گویائی امر تعجب نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی بہنوں کے لیے محی الدین کا اس طرح تقریر کرنا بعید از عقل تھا۔ اب ضروری ہوگیا تھا کہ اس "کھیل" کا ذکر حضرت صاحب سے کیا جائے۔

مولانا خیرالدین عشا کی نماز سے فراغت کے بعد چند مخصوص مریدوں کے حلقے میں ذکر و شغل میں مشغول تھے۔

سوانح

نام..... احمد

لقب..... محی الدین

کنیت..... ابوالکلام

تخلص..... آزاد

تاریخی نام..... فیروز بخت

پیدائش..... ذی الحج ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء

محلہ قدوہ، متصل باب اسلام، مکہ معظمہ

وفات..... ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء

مدفن..... دہلی۔

کچھ دیر تزکیۂ باطن کی تعلیم سے سرفراز کرنے کے بعد ذکر جہر کی مشق کرائی۔ اس کے بعد مریدوں کو اپنی توجہ سے مالا مال کیا اور یہ محفل برخاست ہوگئی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد جب وہ دعا و اذکار سے فارغ ہوچکے اور محی الدین کی والدہ نے سونے سے پہلے کا دودھ ان کے حضور پیش کیا تو موقع دیکھ کر محی الدین کے اس کھیل کا تذکرہ چھیڑ دیا جو وہ دن میں سن چکی تھیں۔

مولانا خیرالدین بڑے اشتیاق سے سنتے رہے لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خوش ہونے کے بجائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کی اہلیہ سے ان کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔

"آپ کیا سوچنے لگے۔ میں نے محی الدین کی شکایت تو نہیں کی۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ وہ ابھی سے اتنا ذہین ہے۔"

"خوش میں بھی ہوں لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب تک اس کی تعلیم کا بندوبست کیوں نہ ہوسکا۔"

"ابھی اس کی عمر کیا ہے؟"

"وہ اپنی عمر سے آگے چل رہا ہے۔ یہ سن کر دکھ ہوا کہ وہ کھیل کود میں پڑ کر اپنی ذہانت ضائع کردے گا۔"

"کھیل کود کیسا، گھر میں بہنوں کے ساتھ لگا رہتا ہے۔"

"کھیل تو کھیل ہی ہوتا ہے۔ گھر میں ہو یا گھر سے باہر۔ اسے اتنا وقت میسر ہی کیوں ہے کہ وہ اسے ضائع کرتا پھرے۔ میں کل ہی کوئی بندوبست کرتا ہوں۔"

شب کے گیارہ بج چکے تھے۔ مولانا خیرالدین پابندیِ اوقات کے بڑے سختی سے کاربند تھے۔ گیارہ بجے کے بعد وہ بستر پر چلے جاتے تھے۔ اس کے بعد کوئی بڑے سے بڑا واقعہ بھی انہیں خلوت گاہ سے باہر نہیں لاسکتا تھا۔ ان کی اہلیہ نے بھی وقت دیکھ کر سلسلۂ کلام منقطع کردیا۔ مولانا کا معمول تھا کہ سونے سے پہلے اپنے تمام متعلقین کے حق میں نام بہ نام دعا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ دعا کا سلسلہ شروع کرچکے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے اس عمل کے بعد ان کی آنکھ لگ گئی۔

مولانا خیرالدین ٹھیک تین بجے بیدار ہوئے۔ وضو کیا اور جائے نماز پر آگئے۔ نوافل ادا کرتے کرتے نمازِ فجر کا وقت ہوگیا۔ ادھر سلام پھیرا' ادھر آفتاب طلوع ہوگیا۔ وہ ابھی تک جائے نماز پر بیٹھے وارد و وظائف میں مشغول تھے۔ نماز اشراق پڑھنے کے بعد بطور ناشتے کے مکھن اور چند بادام کھائے اور پھر تحریر و تصنیف میں مشغول ہوگئے۔

صبح دس بجے دوپہر کا کھانا تناول کیا۔ کچھ لوگ ملاقات کے لیے آئے بیٹھے تھے' ان سے ملاقات کی۔ ظہر کی نماز کے بعد قیلولہ کیا۔ عصر کی نماز کے لیے جانے لگے تو خلافِ معمول محی الدین کو بھی ساتھ لے لیا۔

حرم شریف میں محی الدین کی رسم بسم اللہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نامور شیوخ کی موجودگی میں شیخ عبداللہ مرواد نے محی الدین سے تین مرتبہ "یا فتاح" کہلوایا اور اس کے بعد الف سے سین تک حروف شناخت کرائے۔

مبارک سلامت کے شور میں میٹھے سموسے تقسیم کیے گئے۔ محی الدین للچائی ہوئی نظروں سے ان سموسوں کو دیکھ رہا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس قاب سے جو ان کے سامنے پڑی تھی' ایک سموسہ اٹھا کر اسے دیا اور پھر ہاتھ کھینچ لیا "ہم اپنے ہاتھ سے کھلائیں گے" انہوں نے کہا اور ایک ٹکڑا اپنے دستِ مبارک سے اس کے منہ میں رکھ دیا۔ اس کو حاضرین نے الٰہی برکت قرار دیا جس کے اثر سے بچہ علوم دینیہ میں اکمل ہوگا۔

یہ تقریب گویا محی الدین کے تعلیمی سفر کا آغاز تھا۔ محی الدین کی خالہ نہایت خوش الحان تھیں۔ لکھنا پڑھنا بھی خوب جانتی تھیں لہٰذا محی الدین کو ان کے حوالے کردیا گیا۔ مولانا خیرالدین چونکہ بچوں کو گھر سے باہر بھیجنے کے قائل نہیں تھے لہٰذا تعلیم کا اہتمام گھر پر ہی کردیا گیا تھا۔ کبھی کبھی خود بھی پڑھاتے تھے ورنہ یہ ذمے داری خالہ کی تھی۔

تعلیم کا آغاز ہوتے ہی محی الدین کو یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ کسی خزانے کے قریب پہنچ رہے ہوں۔ کھیل کود پر پابندی پہلے ہی تھی' وہ پڑھنے بیٹھا تو ہر کھیل سے جی اچاٹ ہوگیا۔ سبق شروع ہوتے ہی اس کے ذوق اور قوتِ حافظہ کی کہانیاں گھر بھر میں پھیل گئیں۔ جو سبق ایک مرتبہ پڑھ لیتا' ہمیشہ کے لیے یاد ہوجاتا۔ جلد ہی اس نے قرآن پاک ختم کرلیا اور چند سورتیں حفظ بھی کرلیں۔

حافظ بخاری خطاط اور قاری تھے۔ خوش نویسی کی وجہ سے مولانا خیرالدین نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ وہ ان کی تصانیف کو صاف کردیا کرے۔ جب محی الدین نے کلام پاک کا کچھ حصہ پڑھ لیا تو حافظ بخاری کے پاس بٹھادیا گیا۔ وہ چائے کے بہت عادی تھے۔ بار بار گرم پانی کی کیتلی لانے کے لیے وہ محی الدین کی خوشامد کرتے تھے اور محی الدین پڑھنے کے شوق میں ان کے لیے چائے کا انتظام کرتا رہتا تھا اور آہستہ آہستہ خود بھی چائے کا عادی ہوتا جارہا تھا۔

اس وقت حرم شریف میں سب سے بڑے قاری شیخ حسن تھے۔ خاندان کے کئی لوگ ان کے پاس قرأت سیکھنے جایا کرتے تھے چنانچہ وہ بھی صبح کے وقت ان کے پاس جانے لگا۔

○☆○

عثمانی سلاطین کے محل سراؤں میں دستور تھا کہ محل کے اندر عورتوں کی آبادی ہوتی تھی۔ سلطان کی ماں اس آبادی کی صدر ہوتی تھی اور دوسری عورتیں مختلف عہدوں پر مقرر کی جاتی تھیں۔ ہر سال پندرہ سو کنیزیں خرید کے محل سرا میں داخل کی جاتی تھیں۔ ان کنیزوں میں سے بعض سلطان کے زیرِ تصرف میں رہتی تھیں۔ جب سلطان محمود ثانی تخت نشیں ہوا تو اس نے اس رسم کو بند کردیا اور تمام کنیزوں کو جمع کرکے اعلان کردیا کہ ان میں سے جس کا جی چاہے رہے اور جو چاہے چلی جائے۔

قسطنطنیہ' سمرنا' قونیہ' بروصہ اور مکہ معظمہ میں غلاموں کی بڑی بڑی منڈیاں تھیں جن میں چرکسی' البانی' سوڈانی' بربری' حبشی کنیزیں اور غلام فروخت ہوا کرتے تھے۔ سلطان نے ان سب منڈیوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔

ان اصلاحات سے بہت سے علما اور ان کے ہم خیال لوگوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی اور متعدد مقامات پر شورشیں پھوٹ پڑیں مگر سب کو دبادیا گیا اور سب جگہ غلامی مسدود ہوگئی۔ صرف مکہ معظمہ میں وہ بند نہ کی جاسکی کیونکہ اس زمانے میں شریف عبدالمطلب وہاں کا شریف تھا جس کا بدوی قبائل پر بڑا اثر تھا جس کی وجہ سے ترکی گورنر اس کا

انسداد کرنے سے معذور رہا اور مکہ میں غلاموں کی خرید و فروخت باقی رہی۔

سلطان محمود کے انتقال کے بعد سلطان عبدالمجید تخت نشیں ہوا۔ اپنے پیش رو کی اصلاحات کا وہ بھی حامی تھا بلکہ اس نے تو یہ عزم کیا تھا کہ مکہ سے بھی غلامی کا خاتمہ کردے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے حامد پاشا کو گورنر بنا کر مکہ بھیجا۔ گورنر نے مکہ پہنچتے ہی شریف مکہ کو سلطانی فرمان سے آگاہ کیا۔ شریف اس وقت تو خاموش رہا لیکن اندر اندر تمام انتظامات مکمل کرلیے اور سلطان کے خلاف یہ کہہ کر بغاوت کا اعلان کردیا کہ سلطان نصرانی ہوگیا ہے اور اسلام کو مٹانا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار بدوؤں کی مسلح جماعتیں اس کے محل میں فراہم ہوگئیں۔ حامد پاشا نے مقابلہ کیا لیکن اس کی فوج قلیل تھی۔ مجبوراً جدہ کی راہ سے نکل جانا پڑا۔ اس کے بعد دوسری ترکی فوج آئی اور اس نے مکہ پر قبضہ کرلیا۔

بغاوت ختم ہوگئی تھی لیکن شریف مکہ کا معاملہ بہت پے چیدہ تھا۔ مغلوب ہوجانے کے باوجود اسے اس کے عہدے سے ہٹانا دشوار تھا۔ خود اس نے یہ چالاکی کی کہ بغاوت ختم ہونے کے بعد اپنے آپ کو بغاوت سے بری ظاہر کیا اور خود کو خلیفہ کا وفادار مشہور کیا۔ تاویل یہ پیش کی کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں مجبور ہوگیا تھا۔ اگر ساتھ نہ دیتا تو قتل کردیا جاتا۔ اس کی اس تاویل سے سلطان مطمئن نہ ہوسکا اور موقع دیکھ کر اسے گرفتار کرلیا۔

شریف عبدالمطلب کے بعد اس کا بھتیجا شریف غالب مقرر ہوا۔ مدت کے بعد حکومت کو اس کے طرزِ عمل سے بھی شبہات پیدا ہوئے اور خبریں پہنچیں کہ وہ شریف عبدالمطلب سے نامہ و پیام رکھتا ہے۔

مولانا خیرالدین اب تک ان ہنگاموں سے دور رہے تھے لیکن شریف غالب سے گہرے تعلقات ہونے کی وجہ سے دخل اندازی کا فریضہ انجام دینے پر مجبور کردیے گئے۔ سلطان عبدالمجید نے ان سے ان شکوک میں مدد لینی چاہی جو شریف غالب کے متعلق اس کے دل میں تھے۔

"مولانا' آپ کا کیا خیال ہے۔ شریف غالب ہمارا وفادار ہے یا حکومت کی بیخ کنی پر آمادہ ہے؟" سلطان نے پوچھا۔

"آپ کی اطلاعات کیا کہتی ہیں؟" مولانا نے کہا۔

"اطلاعات تو نہیں لیکن شکوک اس کے خلاف جاتے ہیں۔ آپ کے اس سے مراسم ہیں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے اسے کیسا پایا؟"

"میری حقیر رائے میں یہ شکوک بے بنیاد ہیں اور محض فتنہ پردازوں کے گھڑے ہوئے ہیں" مولانا نے سلطان کو مطمئن کرنا چاہا۔

سلطان ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوسکا اور ان سے مزید شہادتیں بہم پہنچانے کی خواہش کی گئی۔ مولانا ان دنوں قسطنطنیہ میں تھے۔ انہوں نے اہل و عیال کو وہیں چھوڑا اور تنہا مکہ آئے اور شریف سے ملاقات کرکے اسے خطرات سے آگاہ کیا۔

"گورنمنٹ کو تمہاری ایک ایک خبر پہنچتی ہے جس سے گورنمنٹ کو سوئے ظن پیدا ہوگیا ہے اور وہ خاندان شرافت کو مٹا دینے پر آمادہ ہوگئی ہے اس لیے فوراً ایسی کوششیں کرو' جس سے شبہات دور ہوں۔"

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد وہ پھر دارالخلافہ واپس آئے اور شریف عبدالمطلب سے بھی متعدد ملاقاتیں کیں جس کے بعد حکومت کے تمام شکوک رفع ہوگئے۔ شریف عبدالمطلب کی نظربندی موقوف ہوئی اور پیش قرار وظیفہ اسے ملنے لگا۔ مولانا کی کوششوں سے خاندان شرافت تباہ ہونے سے بچ گیا۔

گورنمنٹ کے شکوک بے بنیاد نہیں تھے۔ شریف غالب واقعی حجاز کی خودمختاری کی کھچڑی پکا رہا تھا۔ مولانا خیرالدین اس راز سے واقف تھے لیکن انہوں نے پسند نہیں کیا کہ قبل از وقت فریقین میں سے کسی کا نقصان ہو۔

ابھی اس قضیے سے نجات ملی تھی کہ ایک گل اور کھل گیا۔ نہر زبیدہ کے نام سے ایک نہر ہارون رشید نے بڑے اہتمام سے بنوائی تھی۔ یہ نہر مکہ اور ریگستان میں پانی کا واحد ذریعہ تھی۔ انقلاباتِ زمانہ نے اس نہر کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اب اس کی از سرِ نو تعمیر کی ضرورت تھی۔ مولانا خیرالدین نے سلطنت عثمانیہ کی توجہ اس طرف مبذول کی۔ جب قسطنطنیہ کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو انہوں نے اس کام کا خود ہی بیڑا اٹھانا چاہا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے دو خاص مریدوں حاجی عبدالواحد اور حاجی ذکریا سے مدد چاہی۔ انہوں نے دو

رسائل و جرائد کی ادارت

نیرنگِ خیال۔ احسن الاخبار۔ لسان الصدق۔

الندوہ۔ وکیل۔ دارالسلطنت۔ الہلال۔ البلاغ۔

لاکھ کی رقم فوراً پیش کردی۔ اسی سال نواب کلب علی خاں، والیِ رام پور اور عبدالغنی خاں، نواب ڈھاکا بھی حج میں شریک تھے۔ مولانا ان سے ملے اور اس بارے میں توجہ دلائی۔ نواب کلب علی خاں نے پانچ لاکھ اور عبدالغنی خاں نے ایک لاکھ نذر کردیے۔ اس کامیابی کے بعد مولانا نے اردو میں اپیلیں لکھ کر ہندوستان بھیجیں اور عبدالواحد کو ہندوستان بھیجا کہ چندہ کریں اور اچھے انجینئر منتخب کرکے لائیں۔ چند ماہ گزرے تھے کہ انجینئر آگئے اور بڑی بڑی رقمیں بھی دھڑا دھڑ پہنچنے لگیں۔

مولانا خیرالدین نے سات آدمیوں کی ایک مجلس بنوائی اور تمام فنڈ اس کی تحویل میں دے دیا۔ یہ مجلس ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو یا تو سرکاری آدمی تھے یا شریف مکہ کے زیرِ اثر تھے۔

اس غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب سات آٹھ لاکھ روپے خرچ ہوچکے اور مزید رقم ملنے میں رکاوٹیں شروع ہوگئیں اور بالآخر معلوم ہوا کہ مختلف حیلے بہانوں سے شریف نے باقی فنڈ ہضم کرلیا ہے۔

شریف کی گورنمنٹ نے اس تحریک کو ابتدا میں کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ روپیا بارش کی طرح آرہا ہے تو شرکت کی تاکہ فنڈز پر قبضہ کرسکے اور کام میں رکاوٹیں پیدا کرے۔

جب خیانت کا یقین ہوگیا اور مولانا خیرالدین نے سخت گیری شروع کی تو چونکہ شریف گورنمنٹ بھی اس قسم کی بازپرس کی عادی نہیں تھی، اس پر یہ سخت گیری بہت گراں گزری اور شریف سے ان کے تعلقات بگڑ گئے۔

نہر کا کام ختم ہوگیا تو ایک اور واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ازسرِنو شریف کو مخالفت پیدا ہوئی۔ مولانا خیرالدین کی خواہش تھی کہ کام کے اختتام پر اس کی مفصل رپورٹ بھی شائع کردی جائے چنانچہ انہوں نے رپورٹ تیار کروائی اور چھپوانا چاہی۔ شریف نے اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ جانتا تھا اس رپورٹ سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ کتنا روپیا فنڈ میں جمع ہوا تھا اور کس طرح شریف نے اس کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔

مولانا سے شریف کی دوستی، دشمنی میں بدل گئی۔ مخالفت اتنی سخت تھی کہ مولانا کو اپنی گرفتاری کا یقین ہوگیا تھا لیکن ان کے جذبۂ ایمانی نے اس سختی کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ انہوں نے یہ رپورٹ خفیہ طور پر بمبئی بھیج کر چھپوائی اور وہیں شائع کردی۔

یہ ایسی جسارت نہیں تھی جسے شریف نظرانداز کردیتا۔ وہ کھل کر سامنے آگیا۔ اب ضروری ہوگیا تھا کہ مولانا مکہ چھوڑ دیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ شریف کی اجازت کے بغیر وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتے تھے۔

ایک دن انہیں خبر ملی کہ شریف نے ان کے خلاف اپنی سازشیں پوری طرح مکمل کرلی ہیں اور کسی بھی وقت ان پر عمل ہوسکتا ہے۔ وہ رات سخت گھبراہٹ میں گزر رہی تھی۔ اطمینان کے باوجود تقاضائے بشری تھا کہ جان کا خوف دامن گیر تھا۔ صبح تک کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پچھلی رات تھی کہ انہوں نے بستر چھوڑا اور حرم میں پہنچ گئے۔ طواف کرتے ہوئے انہوں نے خدا سے دعا کی "اے معبود! تو بہتر جانتا ہے کہ کون حق پر ہے اور تو نے حق والوں سے نصرت و حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔"

نمازِ فجر ختم ہوئی تھی کہ حرم میں یہ اعلان گونجا "مکے سے طائف جاتے ہوئے شریف غالب کا انتقال ہوگیا" کسی کی موت پر خوشی زیبا نہیں لیکن یہ خبر ایسی تھی جیسے تلوے کا کانٹا نکل گیا۔

مولانا مکہ چھوڑ کر ہندوستان جانے کا ارادہ کرچکے تھے لیکن شریف کی موت نے ان کے ارادے کو کمزور کردیا۔ آدمی کچھ سوچتا ہے، مشیتِ ایزدی کچھ اور ہوتی ہے۔ اچانک ایک حادثہ پیش آگیا۔ مولانا گر پڑے اور ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے ہڈی جوڑ تو دی لیکن بندش ٹھیک نہ ہوسکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سخت تکلیف پیدا ہوگئی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ہندوستان جاکر علاج کرایا جائے۔

محی الدین کی تعلیم ابھی صرف اتنی ہوئی تھی کہ قرآن ختم کرلیا تھا۔ کچھ سورتیں حفظ کرلی تھیں۔ قرأت کے کچھ لہجوں پر دسترس ہوگئی تھی۔ مکہ شریف کے جید علما تک رسائی باقی تھی کہ مولانا خیرالدین نے رختِ سفر باندھا۔

○☆○

کنگ اسٹریٹ کلکتہ کے ایک وسیع و عریض مکان کا اندرونی صحن سوگوار عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ مردانے میں مولانا خیرالدین کے عقیدت مند اور مرید ان سے تعزیت کے لیے جمع تھے۔ خود مولانا کا حال یہ تھا کہ اپنا دکھ بھول کر سوگواروں کو صبر کی تلقین کررہے تھے۔

مکہ سے ہندوستان آئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ محی الدین کی والدہ کچھ دن بیمار رہ کر انتقال کرگئیں۔ یہ ایک سال بھی اس صورتِ حال میں گزرا تھا کہ مولانا خیرالدین بمبئی میں رہ کر اپنی ٹانگ کا علاج کراتے رہے۔ اس علاج کے باوجود ہڈی تو جڑ گئی لیکن ٹانگ میں ہلکا سا لنگ باقی رہ گیا اور مولانا لکڑی کا سہارا لے کر چلنے پر مجبور ہوگئے۔ وہ

مستقلاً بمبئی میں رہنا چاہتے تھے لیکن کلکتے کے چند بڑے تاجر جو ان کے مرید اور پرستار تھے' انہیں ضد کر کے کلکتہ لے آئے۔ ابھی اس شہر کی مٹی نے ان کے قدم پہچانے بھی نہیں تھے کہ اس صدمے نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

کلکتہ پہنچتے ہی مولانا خیرالدین کی شہرت دیہات و قصبات تک پہنچ گئی۔ گرم بازاری اس حد تک پہنچی کہ روزانہ کئی کئی سو افراد ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے پہنچنے لگے تھے۔ ایسے سہارے فراہم ہوگئے تھے جو انہیں معاش کی فکر سے آزاد کر سکتے تھے۔ یہ ترغیبات ایسی تھیں کہ شہر چھوڑنے کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آسکتا تھا لیکن اہلیہ کی وفات نے انہیں سراسیمہ کر دیا۔ صبر و قناعت کا یہ پیکر حرم شریف کی دیوار سے لگ کر رونے کے لیے بے قرار ہوگیا۔ اہلیہ کی تدفین کے بعد انہوں نے مکہ واپسی کا پختہ ارادہ کرلیا۔ کتابوں کے صندوق کچھ کھلے تھے' کچھ بند پڑے تھے۔ خالی صندوقوں میں ایک مرتبہ پھر کتابیں بھردی گئیں۔ سامان بندھنے لگا۔ مریدوں کو خبر ہوئی تو کہرام مچ گیا۔ شہر سے برکت رخصت ہو رہی تھی۔ حاجی واحد اور کئی دوسرے خاص مرید حاضرِ خدمت ہوئے۔ حاجی عبدالواحد کے اتنے احسانات تھے کہ ان کا کہا ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ مجبوراً ارادہ بدلنا پڑا۔

ماں کے وجود سے گھر خالی ہوگیا تھا۔ روز و شب سے شفقت کا پہلو رخصت ہوگیا تھا۔ اب صرف باپ کی سخت گیری رہ گئی تھی۔ بچوں کا یہ حال تھا کہ ان کے نام سے کانپتے تھے۔

وہ اپنا بچپن جس طرح گزار چکے تھے۔ پچاس ساٹھ برس بعد اپنی اولاد کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے اور کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی ان کے قاعدوں سے سرمو انحراف کرے۔ کھلاتے سونے کا نوالہ لیکن دیکھتے شیر کی نظر سے تھے۔ گھر میں ایک ملازم تھا جو بچوں کو نماز کے وقت مسجد لے جاتا تھا۔ ان اوقات کے سوا گھر سے باہر کا آسمان دیکھنا بچوں کے لیے محال تھا۔ بچے اس ماحول کے عادی ضرور ہوگئے تھے لیکن سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد صرف باپ کی نظر رہ گئی جو ہمیشہ غضب ناک اٹھتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے باہر کی ذرا سی آب و ہوا بچوں کے اُجلے من میلے کردے گی۔ پوری دنیا صرف مکان یا ان کا حلقۂ تربیت تھا۔ ان کی معیت یا اجازت کے بغیر جو بہت کم نصیب ہوتی تھی' کوئی بچہ چوکھٹ کے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

اہلیہ کے انتقال کے بعد جب مولانا کے حواس کچھ بحال ہوئے تو انہیں یاد آیا' محی الدین کی تعلیم کا سلسلہ جو منقطع

ماخذات۔

خودنوشت۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔

ابوالکلام آزاد۔ شورش کاشمیری۔

ابوالکلام آزاد' ادبی و شخصی مطالعہ۔ افضل حق قریشی۔

ہماری آزادی۔ ابوالکلام آزاد۔

ہوگیا تھا' ہنوز تعطل میں ہے جبکہ اس کی عمر اب آٹھ سال کی ہوگئی ہے۔ ایک محی الدین ہی سے کیا ہے' لڑکیاں بھی تشنۂ تعلیم ہیں۔

بچوں کی تعلیم کا بارِ گراں انہوں نے خود اٹھایا۔ اب وہ ہندوستان میں تھے لہٰذا بادلِ ناخواستہ اردو کی تعلیم کا خیال آیا جو اب تک بالکل شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس کا طریقہ بھی یہ رکھا کہ چند مرکب حروف ہاتھ سے لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیے کہ اس کی مشق کرتے رہو۔ کسی درسی کتاب کی ہوا تک اسے لگنے نہیں دی۔ شاید ان کے نزدیک اردو کی کوئی کتاب اس لائق تھی ہی نہیں جسے پڑھایا جاتا۔ گھر میں بھی جتنی کتابیں تھیں' عربی اور فارسی کی تھیں اور وہ بھی صرف مذہبی نوعیت کی۔ گویا اس کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں گیا۔ محی الدین چونکہ قرآن پاک ختم کرچکا تھا اس لیے حرفوں کی شناخت ہو چکی تھی۔ ذہن بھی رسا تھا لہٰذا بہت جلد لکھنے کی مشق ہوگئی اور جو کچھ والد لکھ کر دیتے' اسے اٹک اٹک کر پڑھنے بھی لگا۔ بس یہی بہت تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر فارسی کے گلزار سے خوشہ چینی کا حکم ہوا "خلاصۂ ہندی" اور "مصدر فیوض" پڑھائی گئیں۔ خلاصہ ہندی میں نماز روزے کے مسائل تھے اور مصدر فیوض فارسی قواعد کی کتاب تھی۔ اس کے بعد گلستاں' بوستاں اس کے سامنے رکھ دی گئیں کہ ان سے گزر لو' اعلیٰ کتابیں بعد میں پڑھی جائیں گی۔ یہ کتابیں اچھی طرح ختم ہوگئیں تو منطق اور فقہ کی کچھ کتابوں کا درس دیا گیا۔

مولانا کا طریقۂ تدریس یہ تھا کہ طالب علم کو صرف کتاب نہ پڑھائی جائے بلکہ اس علم سے متعلق جتنی باتیں ہیں' اسے ذہن نشین کرادی جائیں تاکہ جو چیزیں اس کتاب میں نہ ملیں' وہ طالب علم ان باتوں کو دوسری کتابوں میں تلاش کرے اور یوں اسے مطالعے کی عادت پڑے۔ محی الدین تو یوں بھی علم کا شائق تھا۔ گھر میں کتابوں کے انبار

تھے۔ کھیل کود میں وقت ضائع کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ بچپن کی شرارت پر سنجیدگی غالب آچکی تھی۔ مطالعے کے سوا کام ہی کیا تھا۔ اس نے وہ کتابیں بھی پڑھ ڈالیں جو ابھی اسے پڑھائی بھی نہیں گئی تھیں۔

ان کتابوں کے مطالعے سے اس پر یہ راز منکشف ہوگیا تھا کہ اس کا ذہن غیر معمولی کام دے رہا ہے۔ کسی عبارت کو اس نے ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں دہرایا۔ سبق لیتے وقت کی یادداشت کفایت کرتی تھی یا سبق کو تیار کرنے میں جو کچھ بھی ذہن کام کرلیتا تھا' وہی کافی ہوتا اور ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی گزشتہ سبق کا امتحان یا سوال میں کسی طرح کی لغزش ثابت ہوئی ہو۔

مولانا خیرالدین کی مصروفیات وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی تھیں۔ گھر کے قریب مسجد بنوانے کا کام شروع کردیا تھا۔ مریدوں کی بڑی تعداد بھی انہیں مصروف رکھنے لگی تھی۔ حاسد علما سے مناظروں کے لیے بھی وقت دینا پڑتا تھا لہٰذا اب وہ محی الدین کے لیے وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ عربی اور منطق پڑھانے کے لیے ان کے ایک مرید مولوی محمد یعقوب آیا کریں گے۔ فارسی اور فقہ وہ خود پڑھائیں گے۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا۔ فارسی کی کچھ کتابیں اور منطق کی ابتدائی کتابوں کی ورق گردانی مکمل ہوئی تھی کہ مولانا سخت بیمار پڑگئے۔ علالت کی وجہ سے تعلیم کا حرج ہونے لگا تو انہوں نے ایک اور انتظام کردیا۔

"اب تمہیں مولوی نذیر الحسن پڑھایا کریں گے۔ مولوی عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد ہیں اور میں نے ان کی استعداد کو قابل اطمینان پایا ہے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن ایک بات ہم سمجھنے سے قاصر ہیں" محی الدین نے ہمت کرکے کہا "ہندوستان میں کیسے کیسے نامور علما موجود ہیں۔ ہم علمی تحصیل کے لیے ان علما تک کیوں نہیں پہنچ سکتے۔"

مولانا خیرالدین نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس اعتراض پر انہیں ویسا ہی تعجب ہوا جیسے گونگا اچانک بولنے لگے "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ کون کس علمی مرتبے کا حامل ہے۔"

"دہلی اور دوسرے شہروں میں کیسی کیسی درس گاہیں موجود ہیں۔ آپ ہمیں وہاں بھی نہیں بھیجتے۔"

"یہ تو میری بدقسمتی ہے کہ تم یہاں رہ رہے ہو ورنہ تم لوگوں کی تعلیم تو عرب وشام میں ہوتی۔"

"جب تک ہم وہاں نہیں جاتے' یہیں کوئی اچھا انتظام کردیجیے۔"

"مجھے معلوم ہے' کون سی چیز تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

اس سے آگے بحث کرنے کی اس میں جرأت ہی نہیں تھی۔ اتنی بات بھی اس نے نہ جانے کس حوصلے کے تحت کردی تھی اور نتیجہ وہی نکلا تھا جس کی اسے توقع تھی۔ اس کی خواہشوں کی پامالی پر کوئی افسوس کرنے والا بھی موجود نہیں تھا۔ بڑے بھائی ابونصر اسی روایتی تعلیم سے بہل رہے تھے۔

دراصل مولانا خیرالدین کی طبیعت علمی حیثیت سے ایسی بلند واقع ہوئی تھی کہ کوئی ان کی نگاہ میں جچتا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا مالی فراغت اور بے فکری کے باوجود محی الدین کو اس کی ذہنی سطح کے مطابق کوئی استاد میسر نہ آسکا۔ وہ بڑے بڑے عالموں کا نام سنا کرتا تھا اور حیرت کرتا تھا کہ وہ کیوں نہیں ان سے پڑھ سکتا۔ والد کے نزدیک کسی کے مذہبی نظریات درست نہیں تھے' کسی کا علم ناقص تھا۔ خود ان کے مشاغل ایسے تھے کہ پوری توجہ دے نہیں سکتے تھے۔ محی الدین اور اس کے بھائی نے کئی مرتبہ ایسی سازشیں تیار کیں جن کے تحت گھر سے بھاگ کر کسی بڑی علمی درس گاہ میں داخلہ لینا تھا لیکن کسی منصوبے پر عمل کرنے کی ہمت کبھی نہ ہوسکی۔ وہ مجبوراً اسی قدیم درس نظامی کو رٹنے پر مجبور ہوگیا۔

والد کی اس سخت گیری کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ مطالعے کا گہرا ذوق اس کی طبیعت کا خاصہ بن گیا۔ کتب بینی' ذاتی نظر سے مطالعہ اور اس میں استعداد۔ یہی ایسے ہتھیار تھے جو اس کی محرومی کو دور کرسکتے تھے۔

"کتابیں بہت دن سے صندوقوں میں بند پڑی ہیں۔ انہیں دھوپ بھی لگنی چاہیے" ایک دن اس نے اپنے والد سے کہا۔

"دیکھو' کبھی وقت ملا تو صندوق کھولوں گا۔"

"میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ آپ فرمائیں تو یہ خدمت میں بجالاؤں۔"

"بے شک! یہ تو اچھی بات ہے۔"

اس کے والد ایک طالب علم کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ صرف درسی کتابیں پڑھے جبکہ وہ اس سے آگے بھی بہت کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا' ان صندوقوں میں علم کا کیسا خزانہ رکھا ہے۔ اس کے لیے اجازت کی ضرورت تھی اور وہ دھوپ لگانے کے بہانے اس خزانے تک پہنچ گیا۔ اس نے چند کتابیں اپنے پاس محفوظ کرلیں اور باقی کتابوں کو دھوپ میں رکھ دیا۔ اپنے مطلب کی کتابوں کی ایک فہرست بھی بنالی جو آئندہ اس کے کام آسکتی تھی۔

تصانیف

ترجمان القرآن (جلد اول، جلد دوم) تذکرہ۔ غبارِ خاطر۔ کاروانِ خیال۔ مکاتیب ابوالکلام۔ میرا عقیدہ۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد۔ نقشِ آزاد۔ تبرکاتِ آزاد۔ خطباتِ ابوالکلام۔ خصائصِ محمدیہ، ہماری آزادی۔ مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب۔ معارف النغمات۔ حیاتِ سرمد۔ حقیقتِ معجزات۔ اسلامی توحید اور مذاہبِ عالم۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی۔ مضامینِ لسان الصدق۔ باقیاتِ ترجمان القرآن۔ رسولِ رحمتؐ، انبیائے کرام وغیرہ۔

وہ کتابیں جو مولانا آزاد کے قلم سے نکلیں لیکن نہ کبھی اشاعت کا منہ دیکھ سکیں نہ کسی نے کسی حال میں دیکھا۔ غالباً تلف ہو گئیں۔

تفسیر، ترجمہ، مقدمہ۔ سیرت شاہ ولی اللہؒ۔ دیوانِ غالب پر تبصرہ۔ شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر تبصرہ۔ سیرتِ حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ القول الثابت، سیرت طیبہ از قرآن مجید۔ سیرتِ امام احمد بن حنبلؒ۔ سیرتِ امام ابن تیمیہؒ۔ حدیثِ غربت کی شرح۔

وہ بڑی بے چینی سے ان کی روشنی کو رات کے اندھیرے میں بدلتے ہوئے دیکھنے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی رات ہوئی، دسترخوان اٹھ چکا اور نماز سے فراغت ملی، وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ سرہانے رکھی موم بتی کو روشن کیا اور تکیے کے نیچے سے کتاب نکال کر اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ یہ کتاب اس کی عمر اور تعلیمی استعداد سے بہت آگے تھی لیکن وہ اپنے ذہن کی رسائی پر حیران رہ گیا۔ ابتدا میں کچھ الجھن ہوئی لیکن محض چند اوراق کے بعد مطالب اس پر کھلنے لگے۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں لیکن وہ ایک ہی رات میں اس ضخیم کتاب کو ختم کر لینا چاہتا تھا۔ ایک کاپی اس نے پہلے ہی سے نکال کر رکھ لی تھی جس پر وہ ضروری نوٹس لکھتا جا رہا تھا جو زیادہ تر اس کتاب کی بعض عبارتوں سے اعتراضات پر مبنی تھے۔

اب یہ مشغلہ اس کی ہر رات کا معمول بن گیا۔ وہ کتابوں کے بحرِ زخار سے علم کے موتی چنتا رہا اور اپنی تعلیمی استعداد میں اضافہ کرتا رہا۔ مطالعے کا شوق جنون کی طرح غالب تھا۔ حافظہ ایسا پایا تھا کہ جو پڑھتا، لوحِ دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا۔

فارسی اور عربی کی یہ کتابیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن و دل پر تحریر ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ دنوں بعد ان کتابوں کی یکسانیت اسے پریشان کرنے لگی تھی۔ ان کتابوں کے موضوعات محدود تھے۔ وہ کسی کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا تھا، جہاں نت نئے پھول کھلے ہوں اور وہ ہر پھول سے مشامِ جاں آباد کر رہا ہو لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان صندوقوں میں ایک ہی قسم کی کتابیں بند تھیں۔ اب تو یہ حال ہو گیا تھا کہ کسی کتاب کے محض چند اوراق پڑھنے کے بعد ہی اسے محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اس کتاب کو پہلے بھی پڑھ چکا ہے۔

جیسے وہ ان صندوقوں میں بھری کتابوں کو پہلے ہی ہضم کر چکا ہے۔ اس کا مطالعہ اب اتنا ہو گیا تھا کہ اس کے وہ اساتذہ جو اسے میسر تھے، انہیں ان کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگی ہو گی۔

والد گرامی بہت دن سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ ایک دن طبیعت کچھ سازگار ہوئی تو انہوں نے محی الدین کو اپنے پاس بلایا۔ اس وقت متنِ وقایہ کی پے چیدہ عبارت ان کے سامنے کھلی رکھی تھی۔

"کتاب النکاح کا یہ ٹکڑا جو محرمات سے متعلق ہے۔ مطالعہ کرو، کل اس کی تشریح کرنا۔"

"کل کی شرط کیوں۔ میں ابھی حل کیے دیتا ہوں۔"

ترکیب عبارت کے اعتبار سے یہ ٹکڑا شارحین کے نزدیک بہت مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن محی الدین نے کتاب کو ہاتھ لگائے بغیر محض اپنی یادداشت سے حل کر کے عرض کر دیا۔ مولانا اس کے جواب سے اتنے خوش ہوئے کہ وہ کشمیری شال جو وہ اوڑھے بیٹھے تھے، اس کی طرف اچھال دی۔ یہ اس کے لیے اس کے علمی اعتراف کے طور پر انعام تھا۔

مطالعے کی کثرت اور حد سے بڑھتے ہوئے اعتماد نے اسے کسی حد تک گستاخ کر دیا تھا۔ کتابیں پڑھتے ہوئے اعتراضات کا ہجوم اس کے دماغ میں شور مچاتا تھا۔ والد سے تو بحث کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن دوسرے اساتذہ اس کے سوالات سے پریشان ہو جاتے تھے۔ یہ اعتراضات محض شرارت نہیں تھے۔ جب وہ مستند کتابوں کے حوالے دے کر اعتراضات اٹھاتا تو اساتذہ مبہوت ہو جاتے۔ انہیں یہ حیرت ہوتی کہ ابھی تو وہ ابتدائی کتابوں سے گزر رہا ہے۔ اسے اعلیٰ

کتاب کے مندرجات کا علم کیسے ہوگیا۔ اگر کوئی کتاب ہاتھ لگ بھی گئی تو وہ اس کی حقیقت تک کیسے پہنچ گیا۔ اس کی تفہیم پر کیسے قادر ہوگیا؟

ان دنوں وہ مولوی نذیر الحسن سے پڑھ رہا تھا لہٰذا وہی اس کا نشانہ بنتے۔ وہ چیختے تھے' کتاب پٹک دیتے تھے' اٹھ کر ٹہلنے لگتے تھے۔ نہ اس کے اعتراضات ختم ہوتے تھے نہ ان کے جوابات۔ رفتہ رفتہ انہوں نے یہ احتیاط شروع کردی کہ اسے پڑھاتے وقت کسی دوسرے طالب علم کو ساتھ نہ لاتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں لاجواب ہوتے ہوئے کوئی دوسرا طالب علم دیکھے۔

ایک مرتبہ مولوی نذیر الحسن نے ایک مشہور مسئلے پر نہایت مغزپاش تقریر کی۔ یہ مسئلہ تھا بھی ایسا کہ شارحین نے اس پر بڑی مجادلانہ قوتیں خرچ کی ہیں۔ دوسرے دن انہوں نے امتحان کے طور پر سوال کرنا چاہا تو محی الدین نے انہیں روک دیا اور جواب میں خود ایک تقریر کرڈالی جس میں مبحث کا خلاصہ' معترضین کے دلائل اور اپنے اعتراضات بڑی تفصیل سے بیان کرڈالے۔ وہ حیرت کی تصویر بنے اس دس گیارہ سال کے بچے کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے اعتراضات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے۔

"اب تمہیں پڑھانا چاہیے۔ پڑھنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

انہوں نے اپنی رائے کا اظہار مولانا خیرالدین سے بھی کردیا۔ انہوں نے کسی قدر تامل کے بعد اجازت دے دی۔ اس کے پاس مغرب کے بعد مدرسہ عالیہ کے چند طالب علم سبق پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ محی الدین کی عمر اس وقت دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور وہ انہیں صرف و نحو' منطق' فقہ اور حدیث کا درس دینے پر مامور تھا۔

گھر میں اوپر کے کام کے لیے ایک ملازمہ نئی آئی تھی۔ ملازم اور بھی تھے اس لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن یہ ملازمہ اس کی تعلیم کا سبب بن گئی۔ ایک دن ایک مولوی نما آدمی کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔ مولوی عبدالواحد سہرامی اس کا نام ہے اور اس سے ملنے دوپہر میں اکثر آتا ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ زیادہ غور کرتا۔

وہ تقریباً روز ہی آیا کرتے تھے۔ جب انہیں اپنی بہن کی زبانی محی الدین کے علمی ذوق کے بابت معلوم ہوا تو انہیں ملنے کا اشتیاق ہوا۔ یہ حیرت بھی اس ملاقات کا سبب بنی کہ اتنی کم سنی میں [illegible] کے بعد محی الدین

کو معلوم ہوا کہ وہ حضرت شاعر بھی ہیں اور مولوی فاروق چریاکوٹی کے شاگرد ہیں۔ فارسی اور اردو شاعری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ محی الدین مولویوں سے تو بہت ملا تھا لیکن کسی شاعر سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اسے ان کی باتیں نہایت دلچسپ معلوم ہوئیں۔ اس کے بعد وہ جب بھی اپنی بہن سے ملنے آتے' محی الدین ان کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ وہ اُردو شعرا کا ذکر کرتے' ان کے لطائف اور معرکہ آرائیاں سناتے' اشعار سناتے۔ یہ سب باتیں اس کے لیے بالکل نئی تھیں کیونکہ ابھی تک اردو کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ مبہوت ہوکر ان کی باتیں سنتا۔ ایک دن انہوں نے بتایا کہ کلکتے میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہونے والا ہے جس میں لکھنؤ کے مشہور شاعر جلال لکھنوی بھی آرہے ہیں۔ جلال لکھنوی کے کئی دلچسپ قصے بھی انہوں نے سنائے اور جب مشاعرہ ہوگیا تو اس مشاعرے کی روداد اور اپنی غزل بھی اسے سنائی جو انہوں نے اس مشاعرے کے لیے کہی تھی۔

یہ باتیں اس کے لیے پرستان کی دنیا تھیں۔ اس لیے بھی کہ یہ خشک نہیں دلچسپ تھیں اور اس لیے بھی کہ اس نے کسی کتاب میں یہ باتیں نہیں پڑھی تھیں۔ اسے یہ باتیں اپنے جیسے لوگوں کی کہانی معلوم ہورہی تھیں جبکہ اب تک وہ جو کچھ پڑھتا رہا تھا وہ زمین سے الگ کسی دوسری دنیا کی باتیں تھیں۔

مولوی عبدالواحد کی صحبتوں نے اس کے دل میں شوق پیدا کیا کہ وہ بھی اردو کی کتابوں کی سیر کرے لیکن مصیبت یہ تھی کہ نہ تو اسے اردو پر عبور تھا اور نہ ہی گھر میں اردو کی کتابیں تھیں بلکہ اسے تو یہ ڈر بھی تھا کہ اگر اس نے اردو کی کسی کتاب کو ہاتھ بھی لگایا تو حضرت کے غضب سے بچ نہیں سکے گا۔

اس وقت اس کی بڑی بہن اس کے کام آسکتی تھی جسے اردو پڑھنی آتی تھی اور وہ اسے قصوں کی ایک کتاب سے کبھی کبھی قصے سناتی تھی۔ وہ اس کے پاس اردو پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ کتابوں کا مسئلہ یہاں بھی تھا۔ وہ تحریر پڑھنے کی مشق کرتے تو کس کتاب سے کرے۔ اس کی بہن کے پاس جو واحد کتاب تھی وہ اسے کئی مرتبہ ختم کرچکا تھا۔ اسے اپنے والد کے ایک مرید محمد امین یاد آئے جنہیں بہت سے قصے زبانی یاد تھے۔ اس نے اپنی مشکل ان کے سامنے بیان کی۔ انہوں نے دوسرے ہی دن میرامن دہلوی کی "باغ وبہار" اسے لاکردے دی۔ یہ پہلی اردو کتاب تھی جو اس نے مکمل پڑھی۔ اس کے بعد گلزار عجائب' قصہ حاتم طائی وغیرہ کئی

معاصرین کی آرا

"تمام ہندوستان میں ایک عالم تھا جو کم وبیش مجتہدانہ حیثیت رکھنے کا اہل ہو سکتا تھا۔ یعنی ابوالکلام آزاد۔"

(علامہ اقبالؒ)

"مولانا علم کے شہنشاہ ہیں۔ میں انہیں افلاطون' ارسطو' نیشاغورث کی طرح کا ویسا ہی انسان سمجھتا ہوں۔ وہ تاریخ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں جہاں تک تاریخ کے شعور کا تعلق ہے' کوئی بھی ان کا ہم پایہ نہیں۔ سب ان سے پیچھے ہیں۔ اردو زبان ان کی لونڈی ہے۔ وہ عربی' فارسی کے جید عالم ہیں' خطابت کے فن میں ڈیما سٹھینز اور سسرو کے ہم مرتبہ ہیں لیکن ان کے متعلق ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے' مولانا کو ہم نے دیکھا ہے اور سنا ہے۔ وہ ایک سائنس داں کے انداز میں بات چیت کرتے ہیں اور مباحث کی بوقلمونی کو چند فقروں ہی میں نتیجے پر لے آتے ہیں۔

مولانا میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ عوام سے گریز کرتے ہیں اور اپنے ہی خیالوں کے انسان ہیں۔ انہیں اپنے دماغ پر بھروسا ہے' وہ عوام کی طاقت کو سمجھتے ہیں لیکن ان سے کٹے اور کھنچے رہتے ہیں۔ عوام سے گریزیا عوام سے فراری کا نتیجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہیں۔ مسلمانوں نے ان سے انصاف نہیں کیا۔"

(گاندھی)

"مولانا کو دیکھ کر مجھے وہ فرانسیسی قاموسی اکثر یاد آجاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے پہلے وہاں موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضیہ میں ان کا درک وبصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط وترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا ذہن مدلل' باضابطہ اور سلجھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق وفلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا عام رویہ معقولیت پسند ہے۔

اگر اس قدر خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ کر حصہ لیتے کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز ہے جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت وعمل کی طرف راغب کر سکتا ہے۔"

(پنڈت نہرو)

"اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے باب میں انہیں خاص ملکہ عطا کیا ہے۔ وہ زمانہ حاضر کی فکری تحریکوں کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کو ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظام کائنات کی اساس رکھتے ہیں۔

فی الواقعہ وہ ایک سحر طراز ادیب ہیں۔ ان کا قلم تلوار ہے۔ وہ قرن اول کے غزوات کی چہرہ کشائی کرتے ہیں اور عصر حاضر کی رزم گاہوں میں مسلمانوں کی فتح مندیاں ڈھونڈتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان بے مثال ہے۔ آدمی ان کے الفاظ سے مسحور ہوتا اور مطالب میں ڈوب جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نکتہ آفرینی میں اس وقت ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔"

(مولانا ظفر علی خاں)

مولانا عجیب وغریب دماغی اہلیت لے کر پیدا ہوئے ہیں جن کو زمانے نے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انہیں صرف الہلال والبلاغ کے رئیس التحریر یا ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف ہونے کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔"

(نیاز فتح پوری)

داستانی کتابیں اس کے مطالعے میں آئیں۔ انہی دنوں دلی کے ایک صاحب اکرام اللہ نے جو اس کے والد کے مریدوں میں تھے نہایت رازداری سے عبدالحلیم شرر کا ایک ناول اسے لاکر دیا۔ باپ کی نظریں بچاکر اس نے یہ ناول ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالا۔ یہ صنف اسے اتنی دلچسپ معلوم ہوئی کہ اکرام اللہ کے ذریعے کئی ناول حاصل کرکے پڑھ ڈالے۔

ان ناولوں کے ساتھ کتابوں کے اشتہارات بھی ہوتے تھے ان سے اور ناولوں کا پتا چلتا تھا۔ وہ کتب فروشوں کو خطوط لکھ لکھ کر ناول منگواتا رہا۔

جس مسجد میں وہ نماز پڑھنے جاتا تھا' اسی مسجد کے نیچے مولوی ضیاء الرحمٰن نامی ایک مولوی نے کتابوں کی دکان کھولی۔ اردو کتابوں کا شوق ہو ہی چکا تھا۔ یہ دکان تو اس کے لیے نمائش گاہ ہوگئی۔ نماز کے لیے آتے جاتے اس دکان کی سیر کرنے لگا۔ مولوی ضیاء الرحمٰن کے لیے وہ اجنبی نہیں تھا بلکہ وہ تو اپنی دکان پر اس کا آنا باعثِ برکت سمجھتے تھے۔

عربی' فارسی اور اردو کی کتابوں سے دکان بھری ہوئی تھی۔ وہاں بیٹھ کر وہ ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور جو خرید سکتا' خرید بھی لیتا۔ جیب خرچ کے لیے جتنی رقم ملتی' وہ جمع کرتا رہتا اور پھر ان پیسوں سے کتابیں خرید لیتا۔ یہاں یہ بھی آسانی تھی کہ ادھار بھی مل جاتی۔ محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" اور مختلف شعرا کے دواوین دیکھنے کا موقع یہیں میسر آیا۔

شاعری کا شوق دل میں جگہ بنانے لگا تھا۔ شاعروں کے دیوان پڑھے تو خود بھی کچھ کہنے کا خیال آیا۔ کچھ اشعار کہے بھی لیکن انہیں اس قابل نہیں سمجھا کہ کسی کو سنا سکے۔

ابھی وہ اس راستے پر گھٹنوں گھٹنوں چل ہی رہا تھا کہ عبدالواحد خاں سہرانی نے اسے اطلاع دی کہ ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ مولوی واحد نے اس طرح پر اپنے کچھ اشعار بھی اسے سنائے۔

اس رات اس نے مطالعے سے ہاتھ اٹھایا اور مصرعۂ طرح پر غور کرنے لگا۔ مصرعہ طرح تھا "پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی" طبیعت پر ذرا زور ڈالا تو کئی مصرعے پردۂ ذہن پر نمودار ہوگئے۔ وہ ایک کے بعد ایک کو رد کرتا رہا اور بالآخر ایک مصرعہ اس کی نظر میں جچ گیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرا مصرعہ لگا کر اس نے مطلع مکمل کرلیا۔

نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

اس کے فوراً بعد ایک شعر وارد ہوگیا۔

گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائباں کی

پھر ایک شعر اور ہوا اور رات بھر میں تین شعر کہہ ڈالے۔ اشعار کہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ شعر کہنے کے ساتھ ہی شعر سنانے کی خواہش بھی دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اسے بڑی بے چینی سے کسی سامع کی تلاش تھی لیکن اس گھر میں شعر کہنا بدعت سے کم نہیں تھا' کسی کو سنانا تو بڑی بات' یہ کڑوی گولی عبدالواحد کو ہی کھلائی جاسکتی تھی چنانچہ جب وہ آئے تو اس نے غزل کی تکمیل کا مژدہ سنایا۔

"اس سے پہلے تو آپ نے کبھی نہیں فرمایا کہ آپ شعر کہتے ہیں۔"

"کہتا کہاں ہوں۔ پہلی مکمل غزل تو یہی ہوئی ہے اور اس کی تحریک بھی آپ کی غزل ہی سے ہوئی۔"

"کمال ہے۔ پھر ہم کیوں محروم ہیں۔ ارشاد فرمایئے۔"

اس نے مطلع پڑھا۔ مطلع سنتے ہی عبدالواحد خاں چیخ اٹھے اور اس قدر تعریف کی کہ فتح مندی کے احساس نے محی الدین کو سر سے پاؤں تک فخر و غرور بنا دیا۔ دوسرا شعر سنا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "میاں! پہلی غزل اور ایسی غزل!" انہوں نے داد و تحسین کا وہ شور بلند کیا کہ محی الدین کو یہ شک ہونے لگا کہ کہیں وہ مذاق پر آمادہ تو نہیں ہیں لیکن جب ہر شعر پر انہوں نے کھڑے ہو ہو کر داد دی تو وہ فتح کے نشے سے مخمور ہوگیا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ تخلیق کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جو علم وہ حاصل کرتا رہا تھا وہ تخلیق نہیں تقلید تھی۔

"میاں' مقطع کہاں گیا۔ غزل میں مقطع بھی تو ہوتا ہے۔" مولوی واحد نے پوری غزل سننے کے بعد کہا۔

"مقطع تو جب ہو جب کوئی تخلص ہو۔ ابھی تک کوئی تخلص ہی طے نہیں ہوا۔"

"آزاد کیسا رہے گا؟"

تخلص طے ہوگیا تو اس نے مقطع کہہ کر غزل مکمل کردی۔

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

غزل کہہ لی تھی لیکن مشاعرے میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ محی الدین نے وہ غزل مولوی واحد کے ذریعے مشاعرے میں پہنچادی۔ انہوں نے محی الدین ابوالکلام احمد آزاد دہلوی کے نام سے یہ غزل مشاعرے میں پڑھ دی۔ دوسرے دن اس غزل کی کامیابی کا احوال بھی اسے معلوم ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ غزل لکھنؤ سے نکلنے والے گلدستے "ارمغانِ فرخ" میں شائع بھی ہوگئی۔

وہ ایک مہینے تک انتظار کی اذیت برداشت کرتا رہا تھا لیکن اپنی غزل اپنے نام کے ساتھ چھپی ہوئی دیکھی تو ساری کوفت دور ہوگئی۔ وہ اپنی اس کاوش کو بہنوں اور بھائی کے سوا کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس شوق کی خبر حضرت کو ہو۔

بہنیں تو خوش ہو کر رہ گئیں لیکن بڑے بھائی نے اس کی شہرت کو رشک کی نگاہ سے دیکھا اور خود بھی ایک غزل لکھ کر

داغ دہلوی کے پاس اصلاح کے لیے بھیج دی۔ محی الدین بھی کیوں پیچھے رہتا۔ اب تک وہ جو کچھ کہتا تھا' اس پر خود ہی اصلاح دے لیا کرتا تھا لیکن بڑے بھائی کی غزل پر داغ کی اصلاح دیکھی تو اسے بھی ایک اعزاز سمجھا اور ایک غزل کہہ کر امیر مینائی کی خدمت میں روانہ کردی۔

اس کی طبیعت تو بس جس طرف لگ جاتی تھی' لگ جاتی تھی۔ شاعری شروع کی تو ہر محاذ سے ہاتھ اٹھا کر شاعری کی سلطنت سنبھال لی۔ لکھنؤ سے کئی گلدستے نکلتے تھے جن میں طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ شاعری کا جنون ہوا تو کوئی ایسا گلدستہ نہیں رہا جس میں اس کی غزلیں شائع نہ ہو رہی ہیں۔ کلکتہ ہی میں نہیں' ان گلدستوں کی وجہ سے کلکتہ سے باہر بھی اس کا نام مشہور ہونے لگا تھا۔

کتابوں کا شوق روز بہ روز جنون کی حدوں کو چھوتا جا رہا تھا۔ کلکتہ پر ہی منحصر نہیں تھا' ہندوستان بھر کے تاجران کتب سے اس کی خط و کتابت تھی۔ ان کتب فروشوں سے اس نے پیشگی کہہ رکھا تھا کہ کوئی نئی کتاب دکان پر آئے' وہ اسے فوراً پارسل کردیں۔ خود اس کا حال یہ تھا کہ وقت مقررہ پر خاکی وردی والے پوسٹ مین کے انتظار میں دروازے پر بیٹھا رہتا تھا۔ ادھر وہ پارسل لایا' ادھر اس نے کمرا بند کرکے کتاب کا مطالعہ شروع کردیا۔ شام تک کتاب ختم ہو جاتی یا اگر دن میں موقع نہ ملتا تو رات ہوتے ہی موم بتی کی روشنی میں کتاب پر آنکھیں جما دیتا۔

مولانا خیرالدین نے ابتدا میں اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کتابوں کے مطالعے سے اس کی تعلیم میں حرج نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے ٹوکنا چھوڑ دیا تھا بلکہ اس کے اس شوق کے لیے مالی اعانت بھی کرنے لگے تھے لیکن اس کا حال تو یہ تھا کہ کتابوں کا سمندر بھی اس کے لیے کم تھا۔ مالی اعانت کے نام پر چند قطرے کس کام آسکتے تھے۔ والد گرامی کے کئی مرید صاحب ثروت تھے اور کسی خدمت کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہتے تھے۔ کتابوں کے حصول کے لیے اس نے ان سے بھی کام لینا شروع کردیا تھا۔ کتابوں کی فہرست ان کے حوالے کردیتا اور کتابیں حاضر ہو جاتیں۔

کلکتے میں ایک سن رسیدہ بزرگ' حکیم عبدالرحیم دہلوی تھے۔ ان کو اردو کتابوں کے مطالعے کا بڑا شوق رہا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ نے ان کتابوں کی فروخت کا اعلان کیا۔ محی الدین کی بے تابی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گھر میں اس طرح ٹہل رہا تھا جیسے شمع کے گرد پروانہ گھومتا ہے۔ باپ سے کہنے کی ہمت نہیں تھی' اپنی جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے۔ اس موقع پر بھی ایک مرید کام آئے اور پورا کتب خانہ اس کی دسترس میں آگیا۔

اس نے تقسیم اوقات کا طریقہ یہ نکالا تھا کہ دن بھر درسی کتابوں سے لڑتا تھا۔ مغرب کے بعد والد درس دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد نماز وغیرہ سے نمٹنے کے بعد صرف سونے کا وقت باقی بچ جاتا تھا۔ اس نے نیند کو مطالعے پر قربان کردیا۔ بہ مشکل دو گھنٹے کی نیند باقی رہ گئی تھی۔ نیند کی کمی نے بھوک پر بھی اثر ڈالا۔ اس کی صحت بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ اس کا سبب وہ بھی جانتا تھا' گھر والوں کو بھی معلوم تھا۔ والد گرامی نے اسے پھر ٹوکا لیکن اب اس دریا پر کوئی بند نہیں باندھا جا سکتا تھا۔

انہی دنوں ایک اور کتب خانہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ کلکتے میں ایک پرانے اہل حدیث مولوی تھے۔ کتب فروشی بھی کرتے تھے اور خود بھی کتابوں کے شائق تھے۔ بہت سی علمی کتابیں' قلمی اور مطبوعہ نایاب تھیں۔ اس کے علاوہ نواب صدیق حسن خاں کی تمام کتابیں ان کے پاس تھیں۔ شرط یہ تھی کہ پورا کتب خانہ فروخت کریں گے۔ اصلی قیمت ہزار پندرہ سو سے کم نہیں تھی لیکن وہ پانچ سو طلب کرتے تھے۔ منشی محمد رضا نے جو اس کے والد کے مرید تھے' خود جا کے تمام کتابیں خریدیں اور اس کے حوالے کردیں۔

نواب صدیق حسن خاں کی کتابیں اس کے خاندانی مسلک سے مختلف تھیں۔ ان کتابوں کے مطالعے نے اس کے ذہن میں ہلچل ڈال دی۔ ان کتابوں میں درج نظریات قدم قدم پر اس کے نظریات سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ ترازو کے پلڑوں کی طرح کبھی ایک طرف جھک جاتا کبھی دوسری طرف۔

شاعری سے متعلق کتابوں کی جستجو میں رسالہ "اصلاح" اور ازاحتہ الاغلاط لکھنؤ سے منگوایا' یہ دونوں رسالے مولوی ظفر احسن شوق نیموی کے تھے۔ ان دونوں رسالوں میں فوائد شعر گوئی اور تصحیح الفاظ پر بحث کی گئی تھی۔ وہ ان رسائل کے مصنف کی اہلیت کا اس حد تک قائل ہوا کہ انہیں خط لکھ کر پٹنہ سے ان کی تمام کتابیں منگوالیں۔ ان میں "سرمہ تحقیق" اور "یادگار وطن" بھی تھی۔ سرمہ تحقیق جلال لکھنوی کے رد میں تھی اور ان کے اردو لغتوں پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر وہ ان کی زبان دانی کا قائل ہو گیا۔ فوراً خط لکھا اور خود کو ان کی شاگردی میں دے دیا۔ ان کی اصلاح اور مشوروں سے اس کی شاعری

میں نکھار آنے لگا اور شوق بھی اتنا بڑھا کہ شاعری کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔

مولانا خیرالدین اپنے بہت چھوٹے بیٹے کی بہت بڑی بڑی فتوحات کو نہایت دلچسپی لیکن تدبر کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس کی ذہانت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ ان کا تجربہ کہتا تھا کہ ایسے ذہین لوگ یا تو بلندیوں کو چھوتے ہیں یا قعرِ مذلت میں گر پڑتے ہیں۔ تیز چلنے والا ہی ٹھوکر کھاتا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ محی الدین کے مزاج میں اعتدال اور مستقل مزاجی کی کمی ہے۔ وہ ہر تیز رو کے ساتھ سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔ اس کا مطالعہ اس کی عمر سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔ وہ اسے سنبھال بھی سکے گا یا نہیں؟ قابل ترین اساتذہ اس سے تنگ ہیں' مناظروں کی دنیا میں اس کی دھوم ہے' شاعری وہ کرتا ہے' فارسی پر اسے عبور ہے' عربی میں وہ بند نہیں۔ مذہبی نکتے چٹکی میں حل کرتا ہے' ادب کو وہ کھنگال چکا۔ اب اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آنا چاہیے۔

مولانا خیرالدین کے ایک جاں نثار مرید مولوی آفتاب الدین تھے۔ انہوں نے اپنی ایک بیٹی کو پیدائش کے وقت ہی مرشد کی گود میں ڈال دیا تھا۔ مولانا ہی نے اس کا نام زلیخا بیگم رکھا تھا اور اب وہ نو سال کی ہوگئی تھی۔ محی الدین کی عمراب تیرہ سال تھی۔ یہ جوڑ برا نہیں۔ انہوں نے بیٹیوں سے ذکر کیا۔ وہ تو اس خیال سے ہی نہال ہوگئیں کہ ان کا بھائی دولھا بنے گا۔ محی الدین اتنا چھوٹا تھا کہ شادی کے نام ہی سے رونے بیٹھ گیا لیکن حضرت کے حکم سے سرتابی اس کی مجال نہیں تھی۔

اس شادی سے اسے کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بندشیں کچھ ڈھیلی ہوگئیں۔ بیوی بھی ملی تو ایسی کہ بیوی کم اس کی مرید زیادہ نظر آتی تھی۔ وہ اگر رات بھر پڑھتا تو وہ رات بھر پنکھا جھلتی رہتی۔

"بندی خدا کی۔ میں تو پڑھنے کے لیے جاگ رہا ہوں' تم تو سوجاؤ۔"

"واہ! آپ اتنی محنت کررہے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں' اچھا لگے گا کہ میں سوجاؤں۔"

"میں تو رات بھر پڑھوں گا۔"

"رات کون سی لمبی ہوتی ہے' میں بھی جاگتی رہوں گی۔"

"مجھے تو جاگنے کی عادت ہوگئی ہے' تم بیمار پڑجاؤ گی۔"

"عادت کا کیا ہے' میری بھی عادت ہوجائے گی۔"

"اچھا' میں کتاب بند کیے دیتا ہوں۔"

"نہیں' آپ پڑھتے رہیے۔ میں نہیں جھلتی پنکھا۔"

محی الدین پھر کتاب پر نظریں جمادیتا۔ وہ مجبور ہوکر لیٹ جاتی۔ دوسرے دن وہ پھر پنکھا لے کر کھڑی ہوجاتی۔ پھر یہی باتیں ہوتیں۔ وہ پھر سونے کے لیے لیٹ جاتی' وہ پھر پڑھنے لگتا۔

جب ایسی وفاشعار بیوی ہو تو روک ٹوک کیسی۔ باپ کی طرف سے اب بھی اتنی اجازت ملی تھی کہ پانچوں وقت کی نماز کے لیے مسجد جاسکتے ہو یا عصر اور مغرب کے درمیان چاہو تو گھومنے کے لیے جاسکتے ہو۔

اتنی ڈھیل ملی تو وہ عصر سے مغرب بلکہ بعض اوقات عشا کے بعد تک مسجد کے زیریں حصے میں بیٹھنے لگا۔ شائقینِ علم اس سے ملاقات کے لیے اسی مسجد میں جمع ہونے لگے۔ علمی بحثیں ہوتیں۔ کوئی صحبت ایسی نہ ہوتی جو بغیر بحث کے ختم ہوجائے۔ منطقی مباحث سب ازبر تھے' مناظرے کا اسلوب اچھی طرح ذہن نشین تھا لہٰذا عموماً مخاطب کی شکست ہی ظہور میں آتی تھی۔ اس کا ہشت پہلو مطالعہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ عموماً بحث کرنے والا ایک' دو علوم پر حاوی ہوتا جبکہ اسے ہر قسم کا لٹریچر ازبر تھا لہٰذا حریف کو لاجواب کردیتا۔ اس کی کم سنی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ کلکتے کے لوگ تھے واقف تھے لیکن جب کوئی صاحب باہر سے آتے اور اس کے بے پناہ علم مشاہدہ کرتے تو اسے معجزہ قرار دیتے یا پھر یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے کہ اس لڑکے کی عمر زیادہ ہے لیکن اپنی کاٹھی سے تیرہ' چودہ کا لگتا ہے چنانچہ شاہ سلیمان پھلواری جب اس سے پہلی مرتبہ ملے تو یہی کہا تھا کہ تم لگتے نہیں ہو ورنہ تمہاری عمر پچیس برس سے کم نہیں ہے۔ اس کی عمر کے بارے میں لوگوں کے یہ خیالات اس کے لیے فخر و غرور کا باعث بھی تھے لیکن غصہ بھی آتا تھا کہ لوگ ایسا گمان کیوں کرتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ ایک کم سن بچے کے ہاتھوں اپنی شکست کا اثر کچھ کم کرلیں۔

اس کی اسی کم عمری نے کلکتہ کے صاحبانِ شعر کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہوا تھا۔ چہ میگوئیاں اس وقت شروع ہوئیں جب اس نے مشاعروں میں شرکت شروع کی۔ دو تین مشاعروں کے بعد مقامی شاعروں نے سانس روک کر اس کی طرف دیکھا۔ ہرچند کہ ان میں کوئی وقیع شاعر نہیں تھا لیکن کہنہ مشق تو تھے۔ ان کی کہنہ مشقی آزاد کی دو چار غزلوں ہی نے لپیٹ کر رکھ دی تھی۔ خاص طور پر جب ایک مشاعرے میں اس کا یہ مطلع چلا تو ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

حلقۂ شعرا میں اس کی کم سنی کے تذکرے ہونے لگے۔ ابھی جس نے عہدِ شباب کی بہار بھی نہیں دیکھی، وہ ایسے ایسے عاشقانہ پھول کہاں سے چن کر لے آتا ہے۔ علم و فضل تو اس کا خاندانی ورثہ ہے لیکن شاعری اس نے کہاں سے سیکھ لی۔ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے ضرور کوئی اور موجود ہے۔

ایک روز وہ مسجد سے نکل رہا تھا کہ اسے شوخ رامپوری مل گئے۔ نہایت کہنہ مشق شاعر تھے اور کلکتہ میں مقیم تھے۔ شاعری میں استادی کا درجہ رکھتے تھے اور مقامی مشاعروں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ شوخ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک کتب فروش کی دکان پر جا کر بیٹھ گئے۔

"میاں، ایک شاگرد نے جان عذاب میں کر رکھی ہے۔ کہیں سے ایک مصرعہ لے آیا ہے اور بضد ہے کہ اس پر غزل کہہ کر دوں۔ میری طبیعت حاضر نہیں ہے۔ تم کچھ شعر نکال دو تاکہ میرا پیچھا چھوٹے۔"

"شوخ صاحب، میں تو نووارد ہوں۔ آپ یہ کام کسی اور سے بھی لے سکتے تھے۔"

"بے شک! لیکن تم ان شاعروں کو جانتے ہو۔ پورے شہر میں گاتے پھریں گے۔ مجھے تم پر یقین ہے کہ تم کسی سے نہیں کہو گے۔ شاگرد کے سامنے میری عزت رہ جائے گی۔"

انہوں نے مصرعہ سنایا۔ محی الدین کچھ دیر مصرعہ طرح گنگناتا رہا، پھر وہیں بیٹھے بیٹھے چند شعر لکھ کر ان کے حوالے کر دیے۔ ہر شعر معنوی طور پر بلند اور زبان و بیان کا شاہکار تھا۔ انہیں حیرت تو بہت ہوئی لیکن اس وقت کچھ کہنے کا مقام نہیں تھا۔

"بھائی، اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ ایک شعر اور ہو جاتا۔"

"وہ بھی لکھ لیجیے۔"

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشا کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

شوخ رام پوری اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے "بھائی پیرزادے، صورت سے تم دس بارہ سے زیادہ نہیں لگتے لیکن تمہارا کلام! واللہ! عقل باور نہیں کرتی کہ یہ تمہارے ذہنِ رسا کی تخلیق ہے" پھر ہاتھ جوڑ کر کہا "مجھے شک تھا کہ تم کسی اور کا کلام پڑھتے ہو۔ میں نے اسی شک کو مٹانے کے لیے تمہارا امتحان لیا تھا۔"

"مجھے معلوم تھا" آزاد نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے کہا لائیے، آپ کا یہ شک بھی زائل کر دوں۔"

اس نے تو کسی سے کوئی ذکر نہیں کیا لیکن شوخ رامپوری نے اس قصۂ امتحان کی خوب شہرت کی اور مشاعروں میں اس کی وکالت کرنے لگے۔ اب یہ حال ہو گیا کہ اس کا شمار جیسے اساتذہ میں کیا جانے لگا ہو۔ کوشش ہوتی تھی کہ شمعِ سخن سب سے آخر میں اس کے سامنے پہنچے۔

اس کی کم عمری ہر جگہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ ایسی ہی صورتِ حال اس وقت پیش آئی جب اس کے استاد شوق نیموی ایک مشاعرے میں شرکت کرنے پٹنہ سے کلکتہ آئے اور اس کے مکان پر ٹھہرے۔ آزاد نے خط لکھ دیا تھا کہ وہ انہیں لینے اسٹیشن پر آئے گا۔ ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صرف خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس لیے استاد اس کے حال اور عمر سے واقف نہیں تھے۔ اس کے خطوں اور کلام کی پختگی سے اسے کبر سن سمجھتے رہے ہوں گے چنانچہ جب اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تو سخت متعجب ہوئے۔

"بھئی، ہمیں لینے تو ہمارے شاگرد محی الدین ابوالکلام آزاد کو آنا تھا۔ آپ ان کے بیٹے ہیں یا چھوٹے بھائی؟"

"میں ہی ابوالکلام آزاد ہوں۔"

"اچھا، آپ ہیں؟" انہوں نے اس طرح کہا جیسے اب بھی انہیں یقین نہ آیا ہو۔

راستے بھر وہ گم صم چلتے رہے۔ یقین اور بے یقینی کے عالم میں کبھی چور نظروں سے آزاد کی طرف دیکھ لیتے، کبھی ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ یہاں تک کہ مکان تک پہنچ گئے۔

گھر پہنچنے کے بعد انہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ ابوالکلام آزاد یہی ہے۔ گفتگو کے سلیقے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی علمی استعداد خاصی ہے۔ اس کے خانوادے کو دیکھتے ہوئے یہ امر تعجب بھی نہیں تھا لیکن جو غزلیں وہ اصلاح کی غرض سے بھیجتا ہے، کیا وہ بھی اسی کی ہوتی ہیں؟ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ قرینِ قیاس نہیں تھا۔

"میاں صاحب زادے، ذرا ادھر تو آیئے" دوپہر کے قریب انہوں نے آزاد کو اپنے پاس بلایا "مشاعرہ تو غیر طرحی ہے لیکن ہم چاہتے ہیں تم مصرعۂ طرح پر غزل کہو، مصرعہ ہم دیتے ہیں۔"

انہوں نے مصرعہ دیا اور آزاد فکرِ سخن میں مشغول ہو گیا۔ مغرب تک ایک دو نہیں، پورے اکتالیس شعر کہہ کر استاد کے سامنے رکھ دیے۔ وہ حیرت سے کبھی اشعار کو دیکھتے تھے کبھی ابوالکلام آزاد کی صورت تکنے لگتے تھے۔

"میاں، ہمارا شک تو دور ہو گیا لیکن استعجاب اب بھی باقی ہے۔ اس عمر میں ایسی زود گوئی، خدا نظرِ بد سے بچائے۔"

○☆○

اس وقت اس کے دو بڑے مشغلے تھے۔ شاعری اور بے پناہ مطالعہ۔ عربی لٹریچر وہ تقریباً تمام کھنگال چکا تھا۔ اب وہ اردو کی دنیا کی سیر کو نکلا ہوا تھا اور لذتِ عظیم کشید کر رہا تھا۔ ان گلیوں کی سیر کرتا ہوا وہ سرسید احمد خاں تک پہنچ گیا۔ یہ ایسا نام تھا جو اس کے گھر میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس نے مجموعہ لیکچرز اور لیکچر اسلام پر دو چھوٹی چھوٹی کتابیں منگوائیں اور رات کو جب سب سو گئے تو نہایت رازداری سے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔ سرسید کی صاف زبان، پُرسوز لہجہ، مدلل انداز۔ ہر صفحے کے بعد اس کے دل کی دنیا ایک نئے تغیر سے آشنا ہوتی چلی گئی۔ اس میں بہت سی چیزیں اس کے قدیم عقائد سے مختلف تھیں لیکن ایسی پُراسرار کشش تھی کہ متنفر ہونے کے بجائے وہ اس میں دلچسپی لیتا چلا گیا۔ صبح تک اس کی فکری بصیرت ایک نئے رخ سے دیکھنے کے قابل ہو چکی تھی۔

اس نے اسی دن ایک دوست کے پتے پر فضل الدین تاجر، کشمیری بازار لاہور سے مجموعہ مضامین تہذیب الاخلاق کی تین جلدیں منگوانے کے لیے خط لکھ دیا۔ ان میں سے ایک جلد مضامین سرسید کی، ایک محسن الملک کی، ایک مولوی چراغ علی کی تھی۔

عقائد میں مزید ہلچل ہوئی۔ وہ حیران پریشان اپنی دماغی کیفیات کو رنگ بدلتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت اس پرندے کی طرح تھی جس کے پنجرے کا دروازہ کسی نے کھول دیا ہو لیکن ابھی اسے اڑنا نہ آیا ہو۔

اس نے تفسیر القرآن کی پہلی جلد جو پنجاب سے چھپی تھی، منگوائی اور پھر رفتہ رفتہ سرسید کی تمام تصنیفات منگوالیں۔ ان تصنیفات کا شوق بہ تدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف آنکھوں میں نہیں بچتی تھی۔

سرسید کی تصنیفات کے مطالعے نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا کیا بلکہ گرویدہ بنا دیا۔ تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں۔ اب شوق ہوا کہ اردو، فارسی، عربی میں نئے علوم کی جتنی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں، انہیں جمع کیا جائے۔ قریب تر اردو تھی لہٰذا اردو کے سرمائے کی طرف نظر گئی۔ سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ نے کچھ تراجم چھاپے تھے، وہ منگوائے۔ مولوی ذکاء اللہ کے بعض تراجم، لکھنؤ چرچ مشن کے ابتدائی عہد کے علمی تراجم اور دوسری چیزیں دیکھیں لیکن طبیعت کو سیری نہیں ہوئی۔ اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مصر و بیروت سے فہرستیں منگوائیں اور پھر کتابیں منگواتا رہا۔

مولانا خیرالدین بمبئی جانے لگے تو دونوں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ وہاں وہ ایک مسجد اور اقامتی فلیٹ بنوا رہے تھے۔ وہ اسے اپنے ساتھ اس لیے لے کر آئے تھے کہ تعمیرات وغیرہ میں ان کا ہاتھ بٹائے گا لیکن اسے ان چیزوں سے کیا سروکار۔ وہ تو بمبئی کی سیر کو نکلا تو کتابوں کی دکانوں میں گم ہو گیا۔ یہاں کئی ایرانیوں کی دکانیں تھیں اور مصری مطبوعات کے کتب خانے بھی تھے۔ اتفاق سے اسے ایک ایسے آدمی کا پتا بھی مل گیا جس نے حال ہی میں کتابوں کی تجارت شروع کی تھی۔ عربی ادب کا شائق تھا لہٰذا اس کے یہاں تمام علوم و فنون کا ذخیرہ موجود تھا۔ یہ دکان اس کے لیے لائبریری بن گئی تھی۔ گھنٹوں وہاں بیٹھ کر مطالعہ کرتا اور مالی حالت کے مطابق کچھ کتابیں خرید بھی لیتا۔ عربی زبان میں چھپنے والی کوئی ایسی تصنیف نہیں تھی جو اس نے یہاں پڑھ نہ لی ہو۔

کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ایرانیوں کو بھی تلاش کرتا رہا جن سے وہ اپنی فارسی استعداد بڑھا سکے۔ بمبئی شہر میں شرفائے ایران کی ایک اچھی جماعت ہمیشہ رہتی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کی ملاقات عہدِ حاضر کے ایک استاد علوم شیخ الرئیس سے ہوئی جو ان دنوں بمبئی آئے ہوئے تھے اور آغا خاں کے مہمان تھے۔

تقریباً سال بھر تک شیخ الرئیس سے اس کی روزانہ صحبت رہی۔ عربی، فارسی، معقولات، معلومات عامہ اور بہت سی باتیں اس نے ان سے سیکھیں۔ علم کا وہ خزانہ اس کے ہاتھ لگا جو اب تک اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ جدید علوم کی ایک کرن بھی اس تک نہیں پہنچنے دی تھی اور اب سب کچھ اس کے سامنے تھا۔

انہی ملاقاتوں میں ایک یادگار ملاقات مرزا فرصت شیرازی کی تھی۔ فرصت شیرازی، ایران کے فاضل اور نئے علوم و السنہ سے آشنا اور نئے طریق تحقیق و تنقید کا ذوق رکھتے تھے۔ آزاد کا ان کے پاس آنا جانا شروع ہوا تو اسی ذوق کا دروازہ اس پر بھی کھل گیا۔

ان ملاقاتوں میں اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب بھی زیر بحث آتے رہے۔ اسلامی دنیا میں تحقیقی خیالات کتنے آگے نکل چکے ہیں، اس سے آگاہی ہوئی۔ قدیمی خیالات کی طرف سے بے زاری مزید بڑھنے لگی۔ اب وہ اپنے خاندانی عقائد اور روشن خیالی کے مابین موازنہ کرنے لگا۔ اسے یہ

سوچ کر تعجب ہوا کہ اس کے والد اور ان کے مریدین ابھی تک "وہابیت اور اس کے رد" میں لگے ہوئے ہیں۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ صندوقوں میں بھری ہوئی کتابوں سے آگے یہ لوگ کچھ نہیں جانتے جبکہ اب تحقیق کی دنیا نئے نئے مناظر سامنے لا رہی ہے۔

وہ بمبئی سے کلکتہ آیا تو عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ جو کچھ اس نے اس ایک سال میں حاصل کیا تھا' اس کو جب سرسید کے خیالات کے ساتھ ملا کر دیکھتا تھا تو اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں دیکھتا تھا۔ اس نئی دنیا کی دل فریبیاں اسے مسحور کیے دے رہی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام دماغی فعالیت اس عالم کے قبضے میں چلی گئی ہیں جس کا نام سرسید ہے۔ فکرو عقائد کی تمام پچھلی باتیں ہیچ نظر آنے لگی تھیں۔ اب معاملہ تقلید و عدم تقلید' وہابیت و حنفیت سے گزر چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایسی بلند جگہ محسوس کرتا تھا جہاں سے یہ تمام جھگڑے بالکل حقیر دکھائی دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسلام کی اصل حقیقت یا سرسید کے الفاظ میں ٹھیٹ اسلام سے آشنا نہیں۔

اس نے اس وقت سرسید سے جو چیز سیکھی' وہ ترکِ تقلید تھی۔ مفسرین کی' فقہا کی' محدثین کی' تمام علما کی تیرہ سو برس کی تمام اجماعی عقائد و مسلمات اور ان کروڑوں اور ان گنت مسلمانوں کی جو تیرہ صدیوں میں گزر چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ اس ترکِ تقلید کے باوجود وہ اس وقت سرسید کا سب سے بڑا مقلد تھا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان تقلید سے کبھی باز نہیں آتا۔ اسے یہ بات یاد ہی نہیں تھی کہ جس کی وہ تقلید کر رہا ہے غلطی تو اس سے بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو بس ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کر رہا تھا۔ ان کی عظمت اس کے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی' ان کا نام اس کے ذہن میں فضائل انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا۔

تفسیر القرآن' تہذیب الاخلاق اور دیگر وسائل کے مباحث تقریباً حفظ ہو گئے تھے اور اب بحث مباحثے کا رخ بالکل بدل گیا تھا۔ اس کے اساتذہ کو اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ پہلے "وہابیت" سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اب یہ ایک دوسری بلا تھی۔ اس کی رسم و راہ سے وہ بے خبر نہ تھے اس لیے مقابلہ بہرحال ہوتا تھا لیکن یہ اسلحے بالکل نئے تھے۔ اس سے بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں تھی۔ اعتراضات نئے' کتابوں کے حوالے نئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے پاس ایسے دلائل ہی ختم ہو گئے جن سے وہ اس کی تشفی کر سکتے۔ وہ تو یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہے تھے کہ اس چودہ سالہ لڑکے کے خیالات گمراہی کی کس قسم میں داخل ہیں۔ وہ بے پناہ کتابوں کے جس جنگل میں بھٹکنے لگا ہے' نظریات کی جس یورش سے اس کا سامنا ہے' اسے اس بھیڑ سے کیسے نکالا جائے۔

جب کوئی صورت تشفی کی باقی نہ رہی تو اس نے سوچا' مضامین لکھ کر اظہار کی صورت پیدا کی جائے۔ جتنا علم اس نے حاصل کر لیا تھا' اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے بیان کیا جائے۔ مصیبت یہ تھی کہ اب تک جو طریقہ درسیات کے حصول کا رہا تھا اس میں لکھنے کی مشق نہیں کرائی گئی تھی۔ جتنی مشق تھی وہ کتابوں پر نوٹ لکھنے تک محدود تھی۔ اردو زبان پر ایسا عبور بھی نہیں ہوا تھا جو اس کے خیال میں کتابت انشا کے لیے ضروری ہوتا ہے البتہ شاعری کے ذوق نے اس کی کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا تھا۔ اسی سہارے کی بنیاد پر اس نے مضامین لکھنے کا آغاز کر دیا۔ آہستہ آہستہ موضوع اور مطالب کے جمع و اقتباس کی راہیں کھلنے لگیں۔

اس نے کئی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے۔ "احیا العلوم" سے تعصب کی مفرتیں اخذ کر کے ایک مضمون لکھا۔ ایک مضمون عوائد و رسوم پر لکھا۔ قدیم اور رسمی افکار و عقائد کی طرف سے شبہات کی بنیاد پڑ ہی چکی تھی۔ تہذیب الاخلاق وغیرہ میں امام غزالیؒ کے مباحث کلامیہ دیکھ کر امام صاحبؒ کی تصنیفات کی جستجو ہوئی۔ بڑی جستجو کے بعد چند رسالے اور ایک مجموعہ ملا۔ مضمون پر سرسید نے ریویو لکھا تھا۔ اس سے شوق ہوا کہ وہ پورے رسالے کا ترجمہ کرے اور وہ ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ یہ پہلا کام تھا جس سے اس کی کاوش پسند طبیعت مطمئن ہوئی۔ اس کے بعد امام غزالیؒ ہی کی ایک اور کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" کا ترجمہ کیا۔

اس مصروفیت اور اس کی لذت نے شاعری کو اس کی نظروں سے اتار دیا۔ اب اس کی نظر اس بلند مقام پر جمی ہوئی تھی کہ مضامین لکھے جائیں جو اس کے نام سے شائع ہوں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ کسی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر ہو۔ یہ خواہش نو عمری کا شغل سہی لیکن وہ سنجیدہ تھا۔ گویا اس کے جذبات نکاسی کی راہ ڈھونڈ رہے تھے۔ شب کی تنہائیوں میں کوئی سرگوشیاں کرتا تھا کہ وہ انشا پردازی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ دنیائے نثر میں ایک نئے اسلوب کی ایجاد کے لیے پیدا ہوا ہے۔ شاعری اور نثر کو ملا کر ایک نیا اسٹائل پیدا کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ چاہتا تھا' اپنی طرز نگارش کا پرچم اس طرح بلند کرے کہ ادب اس کو طرۂ امتیاز سمجھے اور لوگ اس کے سائے میں شگفتگی و توانائی محسوس کریں۔ طرزِ بیان کے

ساتھ وا قعیت وبلندیِ خیال بھی دل ودماغ کو متاثر کرے۔ جس میں تشبیہات کی جدت بھی ہو' استعاروں کی ندرت بھی۔ زبان میں صفائی ہو لیکن مطالب فکر انگیز ہوں۔ مردانہ تیور بھی ہوں اور شاہانہ مزاج بھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کا مقلد ہونے کے باوجود طرزِ نگارش میں اس نے ان کی تقلید نہیں کی۔ ان ہی پر کیا منحصر' ابتدا میں اس نے اس دور کے تمام لکھنے والوں سے اپنی راہ الگ نکالی۔

جب مضمون نگاری کے شوق نے شاعری پر سبقت حاصل کرلی تو اسے شوق ہوا کہ اب غزلوں کے بجائے ان مضامین کو رسائل کی زینت بنائے۔ شیخ عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" ادب کی آنکھ کا تارہ بنا ہوا تھا۔ یہ رسالہ اس کے پاس بھی آتا تھا چنانچہ ایک مضمون' اخبار اور اس کے فوائد پر لکھ کر بھیج دیا۔ جوہری نے قدر پہچانی اور یہ مضمون چھپ گیا۔ یہاں کیا کمی تھی۔ ایک مضمون خاقانی شیروانی کے حالات میں لکھ بھیجا۔ اسے بھی نمایاں جگہ ملی' پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔

وہ مضمون نگار بن چکا تھا۔ اب ایک آرزو باقی تھی کہ کسی طرح اخبار کی ایڈیٹری مل جائے۔ اس کی تکمیل کا سامان بھی ایک روز خود بخود فراہم ہوگیا۔ اس کے والد کے ملنے والوں میں ایک شخص محمد موسیٰ تھا۔ اس نے نیا نیا پریس جاری کیا تھا۔ کاروبار کو پھیلانے کے لیے وہ کچھ اور کام بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس روز بھی وہ مولانا خیرالدین کے پاس مشورے کے لیے آیا ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو اس نے اخبار کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مولانا' میں چاہتا ہوں ایک اخبار نکالوں۔ آج کل اس کام میں بڑی کمائی ہے۔"

"خیال تو اچھا ہے لیکن میں نے ایک دو کے سوا کسی اخبار کو پنپتے نہیں دیکھا۔ ہمارے ملک کی فضا اس صنعت کے لیے سازگار نہیں۔ پھر اچھا عملہ کہاں سے لاؤ گے؟"

مولانا مسلسل اس کی حوصلہ شکنی کررہے تھے۔ ابوالکلام دور بیٹھا پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ والد کے سامنے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن جیسے ہی محمد موسیٰ وہاں سے اٹھے' وہ بھی اٹھ گیا۔

"آپ حضرت کی باتوں میں نہ آئیں۔ اخبار نکالیں' اس کام میں بہت منافع ہے۔ شہرت الگ ہوگی" اس نے باہر نکلتے ہی محمد موسیٰ سے کہا۔

محمد موسیٰ پر مولانا کی باتوں کا ابھی تک اثر تھا لہٰذا اس نے وہی کہا جو اندر سن چکا تھا "حضرت ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا عملہ کہاں سے لاؤں گا۔ کوئی ایسا ویسا مضمون چھپ گیا تو جیل' عدالت کون جاتا پھرے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے اخبار کو میں ایڈٹ کروں گا۔ آپ کا تو صرف سرمایہ ہوگا۔"

"آپ ایڈٹ کریں گے" محمد موسیٰ کو تعجب ہوا "صحافی لوگ تو بہت بھاری بھرکم ہوتے ہیں۔"

"آپ میری عمر پر نہ جائیں۔ میں اس سے پہلے "تیرِ نگاہِ نظر" کے نام سے گلدستہ نکال چکا ہوں۔ مجھے تجربہ ہے۔"

"وہ گلدستہ تھا' یہ اخبار ہے۔"

"اخبار تو اور بھی آسان ہوتا ہے۔"

"عملے کا کیا ہوگا؟"

"اس کا انتظام بھی ہوجائے گا۔ آدھا اخبار تو میں خود ہی بھردیا کروں گا۔ پریس آپ کا اپنا ہے۔"

باتوں میں اس سے کون جیت سکتا تھا۔ محمد موسیٰ بھی شیشے میں اترہی گیا اور اخبار نکالنے پر رضامند ہوگیا۔ مصر سے ایک اخبار "مصباح الشرق" نکلتا تھا۔ آزاد نے محمد موسیٰ کے اخبار کا نام "المصباح" تجویز کیا اور ضروری انتظامات کے بعد ہفت وار المصباح ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہوگیا۔ دنیائے صحافت کا یہ ایسا کارنامہ تھا کہ چودہ سال کا ایک کم عمر لڑکا کسی ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر تھا۔

پہلا نمبر عیدالفطر کے موقع پر نکلا تھا۔ آزاد نے لیڈنگ آرٹیکل "عید" کے عنوان سے لکھا۔ چند دن بعد یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا کہ اس کا یہ آرٹیکل اردو کے کئی اخباروں نے جن میں "پیسہ" اخبار بھی شامل تھا' اپنے کالموں میں نقل کیا۔ محمد موسیٰ بھی اس کی اس کامیابی پر خوش تھے۔

یہ اخبار اس کے لیے ایک خوش گوار تجربہ تھا۔ امام غزالیؒ' نیوٹن اور مسئلۂ کشش ثقل وغیرہ۔ اس نے کئی مضامین اس اخبار کے لیے لکھے۔ ان مضامین کو لوگوں نے پسند بھی کیا لیکن یہ اخبار تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہوگیا۔

اس کا شہبازِ فکر مسلسل مائلِ پرواز تھا۔ مضمون نویسی کے عالم بے مثال سے واقفیت ہوچکی تھی۔ دور' قریب میں اس کا نام بھی اس حوالے سے پہنچ ہی چکا تھا۔ اس نے قلم رکھا ہی کب تھا کہ اٹھانا پڑتا۔ کئی رسائل تھے جن میں وہ ان مضامین کو بہ غرضِ اشاعت بھیج سکتا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ سے نکلنے والا "خدنگ نظر" اور مخزن وغیرہ اس کی ادبی تسکین کا ذریعہ بنے رہے۔

وہ ابھی اپنی پرواز کے لیے نئے آسمانوں کی تلاش میں تھا کہ ایک مستقل ٹھکانا ہاتھ آگیا۔ کلکتے کے عبدالغفار کتب فروش اور ایک صاحب مولوی احمد حسین نے شراکت داری میں ہفتہ وار "احسن الاخبار" کلکتے سے جاری کیا۔ کلکتے سے کوئی اخبار جاری ہو اور آزاد کے قدم وہاں نہ پہنچیں' یہ کیسے ہو سکتا تھا اور پھر احسن الاخبار کا دفتر تو بالکل پڑوس میں تھا۔ وہ ان دنوں امرتلالین میں رہتا تھا۔ گھر سے مسجد کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ بس ایک پتلی گلی کی دوری تھی۔ مسجد کے بالکل سامنے کی عمارت میں اخبار کا دفتر تھا۔ مولوی احمد حسین سے بھی بہت اچھے مراسم تھے جو اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ آزاد نے اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر جب اخبار کے دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا اور ان کے بہت سے کام نمٹانے لگا تو انہوں نے اور بھی شدت سے اس کی آؤ بھگت شروع کر دی۔ وہ فطرتاً کاہل آدمی تھے۔ اکثر ان کی وجہ سے اخبار لیٹ ہو جاتا تھا لیکن جب سے آزاد نے دلچسپی لینی شروع کی تھی' پرچے میں باقاعدگی آگئی تھی۔ اس وجہ سے وہ آزاد کی قدر بھی کرنے لگے تھے اور اعتبار بھی۔ ایڈیٹر وہ تھے لیکن اخبار کا تمام کام آزاد نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

اس مصروفیت کی وجہ سے ایک تو مضمون نویسی کی تحریک پیدا ہوئی' دوسرے یہ فائدہ ہوا کہ دنیا بھر کے اخبارات دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہاں بڑی تعداد میں مبادلے کے اخبارات آتے تھے۔ مولوی احمد حسین نے بڑا اچھا انتظام کیا ہوا تھا۔ قسطنطنیہ' طرابلس' تیونس' الجزائر وغیرہ کے تمام عربی اخبارات مبادلے میں منگواتے تھے' آزاد کے علاوہ ان عربی اخبارات میں کس کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔

ان اخبارات کے گہرے مطالعے سے اسے عالم اسلامی کے مسائل اور سیاسی حالات سے گہری دلچسپی اور واقفیت ہوئی جو ایک اخبار نویس کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ان اخباروں سے انتخاب اور دن کی روشنی میں مضمون نویسی کے مواقع ملتے رہے نیز ان رسائل پر تبصرے وغیرہ بھی اسی کو لکھنے پڑتے تھے۔

شہر میں علمی مذاق عام کرنے اور نوجوانوں میں تحریر و تقریر کا جوش پیدا کرنے کے لیے اس کے خیال میں ایک ایسی انجمن کی ضرورت تھی جو ایسے مواقع پیدا کرے۔ اس نے مصری اخباروں میں ایسی انجمنوں کا احوال پڑھا تھا جو نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں کام آرہی تھیں۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ ایک "ریڈنگ روم" قائم کیا جائے جہاں مبادلے میں آنے والے اخبارات اور رسائل رکھ دیے جائیں۔ اس ریڈنگ روم کا نام اس نے دارالاخبار رکھا اور انجمن کو انجمن اصلاح کا نام دیا۔ مولوی احمد حسین ہی اس وقت اس کے کام آسکتے تھے بلکہ ان ہی کے بل بوتے پر اس نے یہ خواب دیکھا تھا لیکن وہ تھے کہ اخراجات سے گھبرا رہے تھے۔ اس کی سبیل بھی اس نے نکال ہی لی۔ حمیدیہ ہوٹل کے اوپر محمد موسیٰ کا ایک مکان تھا۔ اس کا ایک ہال نما کمرا مل گیا۔ فرنیچر کے لیے چندہ کیا گیا اور دارالاخبار نے کام شروع کر دیا۔ ہر ہفتے انجمن کے اجلاس ہوتے جن میں مختلف موضوعات پر لوگ تقریریں کرتے۔ مباحثے ہوتے' اسکولوں اور کالج کے طلبہ اس انجمن میں خاص طور پر دلچسپی لینے لگے۔

اس انجمن کا بھی سب سے زیادہ فائدہ اسی کو ہوا۔ بچپن میں گویائی کا زبردست جوش وہ اپنے اندر محسوس کرتا تھا۔ اس کے بڑوں کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ بولتا بہت ہے۔ اسے اپنے بچپن کے ایسے کھیل اب بھی یاد تھے جن میں وہ لمبی لمبی تقریریں کیا کرتا تھا۔ اکثر جب کوئی مخاطب نہ ملتا تو وہ اکیلے میں باتیں کر کے اپنا شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ والد کے مریدوں کے سامنے وعظ کیا کرتا تھا اور وہ اسے حضرت صاحب کی کرامت سمجھتے تھے۔ انجمن اصلاح قائم ہوئی اور اس کے تحت جلسے ہونے لگے تو اس شوق کی تکمیل کا موقع ہاتھ آگیا۔ بے پناہ مطالعہ' بلند آواز' مردانہ لہجہ ان سب چیزوں نے مل کر اس کی تقریروں میں گلزار کھلا دیا اور جب وہ اپنی خطابت کے دوران میں حسب موقع فارسی اور اردو کے اشعار پڑھتا تو ان تقریروں کا اثر ہی کچھ اور ہوتا۔ اب وہ شہر میں ہونے والے جلسوں میں بھی مدعو کیا جانے لگا اور اسے ایک باقاعدہ خطیب کی حیثیت حاصل ہونے لگی۔

یہ دور اس کی خوش قسمتی کی معراج تھا۔ اس کی تینوں خواہشیں ایک ساتھ پوری ہو رہی تھیں۔ خطابت کے مواقع بھی مل رہے تھے' مضامین بھی شائع ہو رہے تھے اور وہ اخبار بھی ایڈٹ کر رہا تھا۔ شباب کی آمد آمد تھی۔ سرمستیوں کی عمر تھی' بے خوفی اور بے باکی قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

کلکتہ' ہندوستان کے ایرانی تاجروں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ انگریزوں کی ... تازہ آمد کی وجہ سے کلکتہ میں بیرونی تجارت کی نئی نئی راہیں کھل گئی تھیں اور ان میں ایرانیوں نے بڑا حصہ لیا تھا۔ ان فارغ البال ایرانیوں کی بدولت محرم کے مراسم نہایت تزک و احتشام سے منائے جانے لگے تھے۔

یہ رسوم و عوائد مسلمانوں کی زندگی کا عام عنصر بن گئے تھے۔ محرم کے دوران میں نکلنے والے جلوس اور دوسری

رسمیں اس کے لیے نئی نہیں تھیں لیکن اب اس پر تہذیب الاخلاق کی تعلیمات کا اثر تھا۔ سرسید کا رنگ اتنا چڑھ چکا تھا کہ سرے سے مسلمانوں کے موجودہ عقائد و اعمال ہی کی طرف سے طبیعت میلی تھی' ان علَم اور تعزیوں ہی کا کیا ذکر۔ جوش میں آکر ایک مضمون "اسلام اور محرم" کے عنوان سے لکھ ڈالا اور جوش میں آکر یہ الفاظ تک لکھ دیے "تمام رسوم' رومن اور کیتھولک عیسائیوں اور بت پرست قوموں سے لی گئی ہیں اور ان کے کرنے والے اپنے تئیں اسلام کی خاص روح سے بالکل تہی کردیتے ہیں۔"

مضمون کا چھپنا تھا کہ ایک طوفان امڈ آیا۔ غلطی یہ بھی ہوئی تھی کہ ایسا تیز مضمون محرم کے دنوں میں شائع کردیا جبکہ مذہبی جوش عروج پر تھا۔ جگہ جگہ مجالس ہورہی تھیں۔ مقررین نے ان مجالس میں "المصباح" میں چھپنے والے اس مضمون کا ذکر کیا۔ مذہبی جذبات، کتنی جلد بھڑک جاتے ہیں' یہ صاف ظاہر ہے۔ ذاکرین نے اس مضمون پر نئے نئے انداز سے تبصرے کرکے ثابت کردیا کہ یہ مضمون سنّیوں کی طرف شیعوں پر حملہ ہے۔

دو چار دن کے اندر ہی یہ آگ اس زور سے بھڑکی کہ تمام شہر کی توجہ کھینچ لی اور ہفتے بھر کے اندر ایک تہلکہ مچ گیا۔ مضمون آزاد نے لکھا تھا لیکن مولوی احمد حسین ایڈیٹر تھے لہٰذا انہیں بھی دھمکیاں ملنے لگیں۔ اخبار کا مالک عبدالغفور بھی بیٹھے بٹھائے پھنس گیا حالانکہ اس نے اسی سال تابوت پر منت مانی تھی جسے مضمون نگار نے بدعت بتا کر اس کی مخالفت کی تھی لیکن باور یہی کرایا گیا کہ ایڈیٹر' مالک اور مصنف کی ملی بھگت سے یہ مضمون چھاپا گیا ہے۔

محرم کے دوران میں ہونے والی بیشتر رسمیں کلکتہ کے سنّی بھی انجام دیتے تھے بلکہ خود اس کے گھر میں ان پر عمل کیا جاتا تھا اس لیے جب اس کے والد تک بات پہنچی اور انہوں نے مضمون پڑھوا کر سنا تو اسی نتیجے پر پہنچے کہ آزاد پر وہابیت کا جادو چل گیا ہے۔

شہر میں ایک کمیٹی بن گئی تھی جو اس اخبار کے خلاف توہینِ مذہب کا مقدمہ دائر کرنے والی تھی لیکن مولانا خیرالدین کی بروقت مداخلت اور معذرت نے شیعوں کے غصے کو ٹھنڈا کردیا۔

اس واقعے سے مالکِ اخبار برداشتہ خاطر ہوگیا۔ اس نے تو تجارتی نفع کی خاطر اخبار جاری کیا تھا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ خود اس کی جان کے لالے پڑگئے۔ بالآخر دو تین ماہ بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔

یہ اخبار اس کی تحریری کاوش کی پاداش میں بند ہوا تھا۔ اس نادانی پر اسے بھی افسوس تھا لیکن اس کے بھائی ابونصر کو نہ صرف ملال ہوا تھا بلکہ یہ فکر بھی ہوئی تھی کہ آزاد کی ایسی کاوشیں جاری رہیں تو خاندان کی بدنامی کا باعث بنیں گی۔ اس کی آزاد خیالی اس کی دنیا کو ہی نہیں' اس کی عاقبت کو بھی خراب کردے گی۔ ابونصر کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ آزاد کے خیالات میں وہابیت کی طرف میلان پیدا ہوچکا ہے۔ وہ اس پر بگڑتے بھی تھے اور ایک دوبار والد کے سامنے بھی انہوں نے اس کا اشارہ کردیا تھا۔ اب جو یہ مضمون سامنے آیا تو والد کو بھی یقین ہوگیا کہ کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ وہ ٹوہ میں لگے رہے اور کچھ دن بعد انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ سرسید کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کا رنگ اثر کرنے لگا ہے۔

"میاں صاحب زادے' ذرا ادھر تو آیئے" ایک روز وہ کہیں جانے کی تیاری کررہا تھا کہ اس کے والد نے آواز دی۔

"جی فرمایئے۔"

"سنا ہے' آپ سرسید نیچری کی کتب مطالعہ فرماتے ہیں۔"

"بعض کتابیں شوقیہ میں نے دیکھی ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ بے دین ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم البتہ وہ روشن خیال ہیں۔"

"یہی تو ایک پردہ ہے۔ گمراہی کو روشن خیالی کا نام دیا جاتا ہے۔ گمراہی کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے وہابیت پھر نیچریت اور پھر تیسری قدرتی منزل الحاد کی آتی ہے۔ ذہین آدمی کے سامنے یہ تیسری منزل ضرور آتی ہے۔ میں تمہاری ذہانت سے ڈرتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم ان کتابوں کا مطالعہ ترک کردو۔"

بچپن سے تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ باپ کے سامنے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی سن کر خاموش ہوگیا لیکن نصیحت کے بجائے ایک قسم کی ضد اور ہٹ دھرمی نے جگہ بنالی۔ بھائی کی طرف سے بھی دل میں کدورت آگئی اور والد کے تعصب کے خلاف بھی جذبات بھڑکنے لگے۔ یہ سوچنا اسے گوارا ہی نہیں تھا کہ سب کو میری بھلائی منظور ہے۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ میرے ذاتی خیالات میں کسی کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ساتھ ہی یہ خیال باعثِ فخر بنا ہوا تھا کہ جس روشن خیالی کا میں داعی ہوں' اس کی ان لوگوں کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔

ان خیالات نے اس تیزی سے جگہ بنائی تھی کہ وہ اس

طوفان کو روکنے پر قادر نہیں تھا۔ بے اختیار زبان' دل کی ترجمانی کرتی تھی۔ صبح سے شام تک سیکڑوں باتیں ایسی پیش آجاتی تھیں کہ بے اختیار اس کی رائے ظاہر ہوجاتی تھی۔ گھر کی عظمت وتقدس کی زندگی اور اس کے رسوم وطریق اب اتنے گراں گزرنے لگے تھے کہ وہ انہیں کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی گھر کی فضا میں پیری' مریدی کو پنپتے ہوئے دیکھا تھا۔ دست بوسی اور قدم بوسی کو دیکھا تھا۔ گھنٹوں اس کے دماغ میں یہ سوال گونجتے تھے' لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس سے کیا فائدہ ہے؟ حضرت کے ساتھ ایسا کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ان کے پیر ہیں لیکن یہ مرید ہمارے ہاتھ کیوں چومتے ہیں۔ حضرت انہیں منع کیوں نہیں کرتے۔ یہ تعظیم ہے یا کچھ اور؟ اس نے بارہا اپنے بھائی کی توجہ اس طرف دلائی لیکن انہوں نے ہمیشہ جھڑک دیا۔ یہ سب باتیں اسے ٹھیک نہیں لگتی تھیں۔ جب سرسید کی کتابیں پڑھیں تو اس کے سوال کا جواب مل گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کے گھر میں وہابیوں کو اتنا برا کیوں سمجھا جاتا ہے۔

جب خیالات نے اور زیادہ وسعت اختیار کی تو ان رسومات سے اکراہ کی جگہ نفرت ہونے لگی۔ اس نے خود ہی جواب تلاش کرلیا کہ یہ صرف اس لیے ہے کہ لوگوں پر اپنی فوقیت رکھی جائے۔ اسی جواب نے پاؤں پھیلائے تو یہ بات سامنے آئی کہ اس کا سبب پیری اور اس کے رسوم ہیں۔ اب ان خیالات کی طرف سے اس کے دل میں عقیدت کے بجائے نکتہ چینی آگئی۔ صدہا سوالات سامنے آئے اور وہ ہر سوال کا جواب ڈھونڈنے کی جستجو کرنے لگا۔ یہ تمام کارخانہ کیا ہے؟ پیری مریدی کا مقصد' ہدایت وارشاد' یہ سب باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں۔ جو اعمال واشغال ہیں' یہ سب تو لائق قدر ہیں لیکن اس کے سوا جو کچھ ہے' وہ ٹھیک نہیں۔ اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک کا انبار جمع ہوگیا۔

ان شکوک نے خاندانی زندگی کی طرف سے بے زاری اور عام لوگوں کی زندگی سے دلچسپی پیدا کردی۔ اب وہ کسی غریب طالب علم کو دیکھتا' کسی راہ گیر کو سڑک پر اور اپنے گھر آنے والے کسی معمولی آدمی کو دیکھتا تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ کاش! میں ان کی سی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوجاؤں۔ یہی حال وہابیت کا تھا۔ اس کے گھر میں اس فرقے کے خلاف اتنی تقریریں ہوتی تھیں کہ اس کے ذہن میں عجیب مکروہ تصور ابھر آیا تھا لیکن اب وہ اس فرقے کی طرف سے ہمدردی کے جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ اتنا بڑا گناہ تھا کہ کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہ جذبات اس شدت سے ابھرے کہ وہ کھلے طور پر ان چیزوں کی مخالفت کرنے لگا۔ کم سے کم اپنے ساتھ یہ سلوک پسند نہ کرتا اور سختی سے اس کے خلاف رائے بھی دے دیتا۔ اور جب ایک دن اس نے ایک مرید کو سختی سے منع کردیا کہ وہ اس کے ہاتھ نہ چومے بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت کے ہاتھ بھی نہ چومے یہ سخت بدعت ہے تو یہ بات پوری طرح تسلیم کرلی گئی کہ اس کے عقائد بگڑ چکے ہیں اور وہ اپنے خاندان سے منحرف ہوچکا ہے۔

اس واقعے کے بعد اس کے گھر کی زندگی ایک بہت ہی ناگوار حالت میں بدل گئی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے والد کے غضب کا نشانہ بننے لگا۔ والد کی نظر پھرتے ہی اور سب نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ صرف بیوی تھی جو اتنی کم عمر تھی کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

"آپ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کے خیالات ایسے نہیں ہیں؟"

"تمہارا مطلب ہے جھوٹ بولوں؟"

"اس جھوٹ سے آپ کی زندگی میں سکون آجائے گا۔"

"اب کیسے کہہ سکتا ہوں۔ میں اپنے عمل سے ثابت کرچکا ہوں کہ میرے خیالات ویسے نہیں ہیں جیسے سب کے ہیں۔"

"آپ کہہ دیں کہ اب آپ تائب ہوچکے ہیں۔"

"تائب غلط چیز سے ہوا جاتا ہے۔ تائب تو انہیں ہونا چاہیے جو مجھے نشانہ بنا رہے ہیں۔"

"توبہ' توبہ! آپ حضرت کو غلط کہہ رہے ہیں۔ ابا حضور بھی کہہ رہے تھے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ تو کیا وہ بھی غلط ہیں؟"

"ان سب کو چھوڑو' تم بتاؤ' تمہارا خیال کیا ہے؟"

"میرا مذہب تو وہ ہے جو آپ کا ہو۔"

"یہ تو تم بیوی کی حیثیت سے کہہ رہی ہو۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے ہاتھ بلکہ پاؤں تک چومے؟"

"حضرت صاحب' دوسرے انسانوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔"

آزاد نے اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن اتنی بات معلوم ہوگئی کہ وہ بھی اسے غلط سمجھتی ہے۔ اس سے زیادہ کی اس سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ ایک عزیز مرید کی بیٹی تھی۔ اس نے عالم طفولیت سے یہی

ماحول دیکھا تھا۔ تعلیم بھی اس کی واجبی تھی۔ وہ کیسے ان باتوں کو غلط قرار دے سکتی ہے۔

اس کی طرف سے بھی مایوس ہونے کے بعد اب کون تھا جو اس کے دل کی بات سنتا۔ سب اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی سب کی طرف سے نظریں پھیر کر اپنے آپ میں مگن ہوگیا۔ مطالعہ کرتا رہتا یا اپنے سوالوں پر غور۔

ایک دن وہ کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا کہ اس کے والد نے اسے روک لیا اور نہایت شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یہ ان کا خاص انداز تھا جو وہ کمال مہربانی کے وقت اختیار کرتے تھے۔

"کیا بات ہے۔ تو اتنا گم صم کیوں رہتا ہے اور کیوں ان خیالات میں پڑ گیا ہے۔ کھل کر کیوں نہیں کہتا؟" وہ حسبِ عادت خاموش رہا۔ انہوں نے پھر اصرار کیا۔

"میں نہ وہابی ہوگیا ہوں نہ نیچری ہوں' نہ اپنے خاندان سے منحرف ہوگیا ہوں جیسا کہ آپ نے فرمایا البتہ بہت سی باتوں پر میرے دل کو اطمینان نہیں ہے اور جس سے اطمینان ملتا ہے اس سے لیتا ہوں۔"

"مثلاً کس سے؟" مولانا خیرالدین نے پوچھا۔

"بہت سی باتیں سرسید کی کتابوں میں میرے دل کو لگیں۔ آپ کی جانشینی کے لیے بھائی موجود ہیں۔ مجھے لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے اور پیر بنانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میری التجا ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔"

"کیسے چھوڑ دیں۔ لوگ کیا کہیں گے' مولانا خیرالدین دنیا بھر کو راہِ راست پر لاتا پھرتا ہے خود اس کا بیٹا گمراہی کے غار میں اتر گیا۔ تجھے رجوع کرنا پڑے گا ورنہ اس گھر میں تیری کوئی جگہ نہیں۔"

وہ نہایت طیش کے عالم میں جانے کیا کیا کہتے رہے اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ بس ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ جب زیادہ رقت طاری ہوئی تو وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اجازت لیے بغیر ان کے پاس سے اٹھا تھا۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ بہت دیر تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جیسی تکلیف والد گرامی کے طریقوں پر چلنے میں مجھے ہوتی ہے ویسی ہی تکلیف میری وجہ سے انہیں ہوتی ہوگی۔ اب یا تو میں ان کے رنگ میں رنگ جاؤں یا گھر چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور کسی کو بتائے بغیر بمبئی چلا گیا۔ بمبئی پہنچتے ہی وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ ایک نامعلوم درد کولہے کے پاس محسوس ہوا تھا لیکن کوئی تشخیص نہیں ہوسکتی تھی۔ بمبئی جیسے بڑے شہر میں کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں تھا جو یہ بتا سکتا کہ یہ درد کیوں اٹھا ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔

بمبئی میں مولانا خیرالدین کے بہت سے مرید تھے اس لیے نہ تو اس کا بمبئی میں قیام پوشیدہ رہا اور نہ اس کی بیماری۔ انہی میں سے کسی نے مولانا کو اطلاع بھی کردی۔ وہ سنتے ہی بے قرار ہوگئے۔ بیٹے کی محبت نے جوش مارا۔ وہ فوراً بمبئی گئے اور آزاد کو لے کر لکھنؤ آگئے۔ انہوں نے خود بھی کسی زمانے میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا خود ہی اس کے مرض کی تشخیص کی اور علاج شروع کردیا۔ کامل دو ماہ تک اسے چت لیٹنا پڑا اور کئی مہینے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوسکا۔

اس کی اس بیماری نے گھر میں سب کے دلوں کو پگھلا دیا۔ مولانا خیرالدین بھی اپنی ناراضی کو بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہے البتہ اس کے خیالات کا حال بدستور تھا۔

صحت یاب ہوجانے کے بعد اس نے مسجد جانا شروع کردیا تھا۔ ایک دن وہ مسجد سے نکل رہا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جو ٹخنوں تک کا کرتہ اور چھوٹا سا کوٹ پہنے اور سر پر چھوٹا سا عربی عمامہ لپیٹے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ آزاد نے اسے عرب سمجھ کر عربی میں بات کی۔ اس نے جواب دیا لیکن عربی لب ولہجہ نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا تاکہ حقیقت جان سکے۔ گھر پہنچ کر اس نے حقیقتِ حال دریافت کی۔

"یہ تو مجھ پر کھل چکا ہے کہ آپ عرب نہیں ہیں۔ اصل ماجرا کیا ہے۔ کھل کر بتائیے آپ کون ہیں اور کلکتہ کس غرض سے آئے ہیں۔"

"آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ میں عرب نہیں بلکہ ترک ہوں۔"

"آپ نے اپنا ترک ہونا چھپایا کیوں؟"

"میں نے سنا تھا کہ ہندوستان میں عربوں کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ پریشانی کی وجہ سے چونکہ طالبِ اعانت تھا اس لیے خود کو عرب ظاہر کیا۔" اس شخص کا نام طاہر بک تھا۔ یہ ایک نہایت قابل سیاح شخص تھا۔ ابتدا میں یمن وشام کے مختلف سرکاری عہدوں پر بھی رہ چکے تھے اور اس کے بعد کچھ دنوں تک "ترجمان حقیقت' قسطنطنیہ" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ فرنچ بہت عمدہ جانتے تھے۔ فارسی اور عربی بھی بے تکلف بولتے تھے۔

آزاد بہت جلد اس کی قابلیت کا معترف ہوگیا۔ ایک ہی نشست کی گفتگو میں ظاہر ہوگیا کہ وہ شخص فلسفیانہ خیالات رکھتا ہے اور مذہب میں اس کا وہی رنگ ہے جو سرسید کا ہے۔

آزاد نے اس کے مذہبی خیالات بتائے بغیر صرف یہ کہہ کر والد سے اس کے قیام کی اجازت مانگ لی کہ یہ شخص ترک ہے اور میں اس سے ترکی زبان سیکھوں گا۔ والد نے بھی یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ آزاد ان دنوں جس ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اس نئی مصروفیت کے بعد شاید اس کا ذہن یک سو ہوجائے۔

یہ شخص ایسا خوش بیان تھا کہ چند ہی روز میں اس نے آزاد کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ترکی زبان کا درس دینا بھی شروع کردیا لیکن آزاد کو اس کی زبان سے زیادہ اس کے خیالات سے دلچسپی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باقاعدگی سے ایڈن پارک جانے لگا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اس سے گھنٹوں مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔

ایک روز وہ طاہر بیک کے ساتھ ایڈن پارک میں بیٹھا تھا کہ اچانک محمد یوسف جعفری سے ملاقات ہوگئی۔ یہ کلکتے کے ایک رئیس تھے اور جب آزاد نے "دارالاخبار" قائم کیا تھا۔ وہ اس کے شریک و معاون رہے تھے۔ باتوں باتوں میں دارالاخبار کا ذکر نکل آیا۔

"میاں' آپ کی طبیعت تو ایک جگہ رکتی ہی نہیں" یوسف جعفری نے کہا۔

"مثلاً۔"

"مثلاً یہ کہ دارالاخبار ایک کلب کی حیثیت رکھتا تھا جہاں علمی ذوق رکھنے والے جمع ہوجاتے تھے۔ اب وہ بند ہوگیا ہے جبکہ اس کی ضرورت اب بھی ہے۔ اسے پھر سے قائم کرنے کی کوئی سبیل ہونی چاہیے۔"

"احسن الاخبار کی وجہ سے رسائل واخبارات مبادلے کی صورت میں مل جاتے تھے۔ اخبار بند ہوا تو مبادلے کی صورت بھی باقی نہیں رہی۔"

"انہیں خریدنے کی کوئی صورت؟"

"اس پر تو بہت پیسے خرچ ہوجائیں گے۔ ایک صورت البتہ ہے۔ ایک ماہوار یا پندرہ روزہ پرچہ نکالا جائے اور اس کے مبادلے میں اخبارات منگوائے جائیں۔ اس پرچے پر جو کچھ خرچ ہوگا وہ اول تو خریداروں سے پورا ہوجائے گا اور اگر نہ بھی ہوا تو اس خرچ سے بہت کم ہوگا جو ان اخبارات کی خریداری پر خرچ ہوگا۔"

انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس پر ہونے والے اخراجات کا بار برداشت کرنے کی ذمے داری لے لی۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ ہادی پریس سے اس کی چھپائی کا انتظام کیا جائے گا اور مہینے میں دوبار نکلے گا۔

وہ ایڈن گارڈن سے باہر نکلا تو اس کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے آگ لینے آیا ہو اور پیغمبری مل گئی ہو۔ بیٹھے بٹھائے ایڈیٹری مل گئی تھی اور یہ آزادی بھی کہ اس پرچے میں وہ جس قسم کا مواد چاہے' چھاپ سکتا ہے۔

اس نے اس پرچے کا نام "لسان الصدق" تجویز کیا اور کسی اعلان کے بغیر اس کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع کردیا۔ اس پر بطور ایڈیٹر اس کا نام ان الفاظ میں جگمگا رہا تھا۔ "ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی۔"

اس پہلے شمارے میں اس کے جو مقاصد چھپے تھے وہ یہ تھے۔

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگلہ میں۔

۴۔ تنقید یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو۔

اس پرچے کے شائع ہوتے ہی صحافتی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ یہ مقاصد محض دعویٰ نہیں رہے بلکہ اس میں شائع ہونے والے مضامین کے معیار' نقطۂ نگاہ اور انفرادیت نے اس پرچے کو درخشندہ کامل بنادیا۔

جب یہ رسالہ ریویو کے لیے معاصرین کے پاس پہنچا تو اسے عصرِ حاضر کا ایک اہم پرچہ ماننے میں کسی کو حجاب نہیں تھا۔ سب نے لکھا تھا' ان کے خیال میں لسان الصدق ایک بڑے معمار اور کہنہ مشق اہلِ قلم کی ایڈیٹری میں جاری ہوا ہے جو عرصے سے اخبارات و رسائل میں مضمون نویسی کررہا ہے حالانکہ آزاد کی عمر اس وقت پندرہ سال سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی۔

جس نے اسے دیکھا نہیں تھا' وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایسے معتبر اور بامقصد رسالے کا ایڈیٹر اتنا کم عمر بھی ہوسکتا ہے۔ اس عمر میں تو لڑکے اپنی تعلیم سے فارغ نہیں ہوتے۔

یہ اس کی ذہنی دنیا کا وہ دور تھا جب سرسید کی تقلید اور عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی کسی تحریر کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس پرستش

کا اثر تھا کہ ان کے ساتھیوں کو بھی وہ اتنا ہی محترم سمجھتا تھا۔ اسے یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ کوئی اعتراض کرے اور وہ بھی "حیاتِ جاوید" پر۔ یہ تو گویا حالی پر بھی اعتراض ہوتا' سرسید پر بھی۔

شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالے "مخزن" میں حیاتِ جاوید پر تبصرہ شائع کیا تھا اور عبارت و مطالب پر چند اعتراضات کیے تھے۔ اعتراضات بہت دھیمے اور ہلکے تھے۔ ایسے ہرگز نہیں تھے کہ کسی کو بھڑکنے کا موقع مل جائے۔ ایک اور تبصرہ حبیب الرحمٰن شیروانی نے کیا تھا' اس ریویو میں تھوڑی سی نکتہ چینی مذہبی عقائد کے متعلق کی گئی تھی۔

آزاد پر یہ تبصرے نہایت شاق گزرے خصوصاً ایسے وقت جب ردِ عمل ظاہر کرنے کا ذریعہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے لسان الصدق میں حیات جاوید پر ریویو کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور اس سے پہلے اس نے اپنے مخصوص انداز میں اب تک ہونے والی نکتہ چینیوں کی تردید بڑے جوش و خروش سے کی۔ بعض اخبارات نے اس کی تائید کی' بعض نے مخالفت اور اس طرح ایک نئی بحث چھڑ گئی۔

اس بحث کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کا نام سرسید کے ایک بڑے طرف دار کی حیثیت سے سرسید کے قدردانوں تک بھی پہنچ گیا اور مخالفوں تک بھی۔ ساتھ ہی ابتدا ہی میں یہ اعتبار قائم ہو گیا کہ لسان الصدق نہایت وقیع پرچہ ہے جس میں سنجیدہ علمی و ادبی بحثیں چھپتی رہتی ہیں نیز یہ کہ اس پرچے کا ایڈیٹر نہایت قابل شخص ہے۔

لسان الصدق کا اجرا اس مصلحت کے تحت ہوا تھا کہ مبادلے میں دنیا بھر کے اخبارات آئیں گے اور انجمن الاصلاح پھر سے زندہ ہو جائے گی۔ یہ مقصد توقع سے بڑھ کر پورا ہو رہا تھا۔

انجمن کے جلسوں اور شہر میں ہونے والے جلسوں میں تقریریں کرتے کرتے وہ تھک چکا تھا۔ اسے کلکتہ جیسا وسیع شہر چھوٹا سا میدان نظر آنے لگا تھا۔ اب یہ اس کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ خان بہادروں اور شمس العلماؤں کے جلسوں میں تقریریں کرتا پھرے۔ اب تو اس کی نظر ملک کی مشہور کانفرنسوں اور پلیٹ فارموں پر تھی۔

بڑی قومی مجلسیں جو ہر سال منعقد ہوتی تھیں' دو تھیں۔ علی گڑھ کی ایجوکیشنل کانفرنس اور لاہور کی انجمن حمایت اسلام۔ اردو کے تمام بڑے بڑے مقررین انہی دونوں مجلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ اخبارات میں جب ان تقریروں کے اقتباسات اور جلسوں کی رپورٹیں شائع ہوتیں' دل میں ایک عجیب ولولہ پیدا ہوتا۔ یہ حسرت دل میں کروٹیں لیتی کہ کاش ان میں سے کسی پلیٹ فارم پر وہ بھی کسی دن نظر آئے۔ مولوی نذیر احمد' نواب محسن الملک' مولانا حالی' شبلی وغیرہ کے ناموں سے واقفیت ہو چکی تھی لیکن ملاقات کا شرف نہ مل سکا تھا۔ ان کانفرنسوں میں شرکت کا موقع مل جائے تو ان حضرات سے ملنے کا موقع بھی مل جائے۔ یہ خیال آتا تھا تو دل میں کوئی چٹکیاں سی لیتا تھا۔

اس وقت اسے اپنی بے بسی پر رونا آگیا جب اس نے اپنے ہی اخبار میں انجمن حمایت اسلام کا پروگرام چھاپا۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا کہ کسی طرح وہ بھی ان جلسوں میں شریک ہو جائے۔ دل میں کچی عمر کی جھجک ابھی باقی تھی۔ ہر ایک سے ملنے یا اپنا مدعا بیان کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ورنہ خط و کتابت تو سب ہی سے تھی۔ شرکت کی کوئی سبیل نکالی جا سکتی تھی۔

جیسے جیسے جلسے کے دن قریب آتے جا رہے تھے' اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں تقریریں کر رہا تھا۔ بالآخر دل مسوس کر رہ گیا لیکن گزرنے والی ساعتوں کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ دفتر میں ڈاک روزانہ ہی آتی تھی۔ اس نے ان لفافوں کو الگ کیا جو براہِ راست اس کا نام لے کر لکھے گئے تھے۔ ایسے خط عموماً اس کے ذاتی ملاحظے کے لیے ہوتے تھے۔ اس نے ایک ایک لفافے کو چاک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ ایک لفافہ کھولتے ہی اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ یہ دعوت نامہ تھا۔ انجمن حمایت اسلام کے کارپردازِ مجاز نے اسے مدعو کیا تھا۔ ایک موضوع بھی لکھا تھا جس پر اسے تقریر کرنی تھی۔ اس نے دعوت نامے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور جب یقین ہو گیا کہ یہ اسی کے نام ہے تو اسے اپنی قسمت پر خود رشک آنے لگا۔ اس نے اسی وقت شیخ عبدالقادر کو خط لکھ کر دعوت نامے کی وصولی کی رسید بھیج دی۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ والد کی طرف سے اجازت ملتی۔ وہ اگر انکار کر دیتے تو پھر جانا محال تھا۔ اس نے چند دوستوں سے ذکر کیا اور گھر میں کسی کو بتائے بغیر پنجاب میل میں بیٹھ گیا۔

راستے بھر طرح طرح کے جذبات سے کھیلتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ اب ایک اور مسئلہ درپیش آیا۔ اسے اس کے پرچے لسان الصدق کی شہرت کے طفیل بلایا گیا تھا۔ سب کا اندازہ یہی تھا کہ کوئی معمر بزرگ ہوں گے لیکن اسے تو ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مسیں بھیگنے کی عمر تھی۔ شہابی رنگ پر سبزے کا آغاز تک نہیں ہوا تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے یہ خبر سب تک پہنچ گئی تھی کہ لسان الصدق کے

ایڈیٹر بھی تشریف لا رہے ہیں۔ اب جو ایک بے ریش لڑکے کو ایڈیٹر کے طور پر اپنے سامنے دیکھا تو سب کو مایوسی ہوئی۔

انجمن کے ان مہمانوں میں مولوی وحید الدین بھی تھے۔ وہ ان کے متعلق بہت کچھ پڑھ اور سن چکا تھا اور ملنے کا آرزومند تھا۔ کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے ایک قدرتی جھجک کے ساتھ اس نے اپنا تعارف لسان الصدق کے ایڈیٹر کے طور پر کرایا۔ یہ تعارف ہی ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ لڑکا اتنے وقیع پرچے کا ایڈیٹر کیسے ہو سکتا ہے اور صرف ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ اس نام سے اس کے نہایت عمدہ آرٹیکل بھی چھپتے رہے ہیں۔ مشاعروں میں لوگوں کو غزلیں چراتے ہوئے تو دیکھا ہے لیکن اس نے تو پورا ایڈیٹر ہی چرالیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لڑکا فرضی ایڈیٹر بن کر آگیا ہو۔ بہرحال جب انہیں یقین ہو گیا تو اصرار کیا کہ چلو مولانا حالی سے ملنے چلو۔ وہ اپنی حیرت میں مولانا حالی کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔

مولانا حالی اپنے بیٹے مولوی تصدق حسین کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ آزاد کی ایک اور دیرینہ آرزو پوری ہونے والی تھی۔ وہ سرسید سے تو نہیں مل سکا تھا لیکن ان کے نورتنوں میں سے ایک سے ملنے کی سعادت مل رہی تھی۔ وہ اپنے پرچے میں "حیاتِ جاوید" کے حق میں لکھ چکا تھا۔ اس سلسلے کو حالی نے ضرور پڑھا ہوگا۔ وہ مجھ سے نہ سہی، میرے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔

شرافت اور سادگی کا پیکر مولانا حالی اس کے سامنے تھے۔ غرور سے پاک نرم مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ انہوں نے بزرگی کے باوجود کھڑے ہو کر مہمانوں کا استقبال کیا۔

مولوی وحید الدین نے بغیر کسی تمہید کے آزاد کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی؟"

مولانا حالی اس اچانک اور عجیب و غریب سوال پر کچھ دیر کے لیے چکرا گئے۔ پھر کچھ دیر تامل کرکے کہا "ابھی بہت کم سن ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ عمر بتلائیے کتنی ہوگی، پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔"

"یہ صاحب زادے لسان الصدق کے ایڈیٹر ہیں۔"

"لسان الصدق کے؟ وہ جو کلکتے سے نکلتا ہے۔"

"جی ہاں، میں ہی اس کا ایڈیٹر ہوں" اس مرتبہ ہمت کرکے آزاد نے کہا۔

مولانا حالی کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ معاملے میں کوئی پیچیدگی محسوس کر رہے ہیں۔ ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے مولوی وحید الدین نے اپنے تعجب کا ذکر کرکے انہیں یقین دلایا کہ یہی ایڈیٹر ہیں۔

اس یقین کے بعد ایک حیرت زدہ خوشی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ نہایت شفقت سے اسے اپنے قریب بلایا اور حالات پوچھنے لگے۔

"کیا ابھی آپ پڑھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں اپنی تعلیم ختم کر چکا ہوں۔"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"دو تین سال۔"

اس پر انہیں مزید حیرت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی شفقت میں اضافہ ہو گیا۔ دیر تک دعائیں دیتے رہے۔ انہیں انجمن کے جلسے میں نظم پڑھنی تھی اور نظم ابھی لکھی نہیں تھی۔ ان کی وضع داری نے یہ تو نہیں کہنے دیا کہ آپ لوگ چلے جائیں البتہ یہ اشارہ دے دیا کہ نظم لکھنے پر طبیعت مائل ہو رہی تھی کہ آپ حضرات تشریف لے آئے لہٰذا ان دونوں نے اجازت چاہی اور انہوں نے بخوشی روانہ کردیا۔

تیسرے دن شب کو انجمن کا نہایت پُررونق اجلاس ہوا۔ مولانا نذیر احمد اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ اسی اجلاس میں آزاد کو لیکچر دینا تھا۔

اکہرے بدن کا نوعمر، خوبصورت مقرر سیاہ شیروانی میں ملبوس، سیاہ عربی عبا پہنے، سر پر عربی وضع کا سیاہ رومال باندھے ممبر پر چڑھا اس سیاہ رومال کا ایک حصہ چہرے کے بائیں جانب لٹکا ہوا تھا۔ آواز کی دلکشی، زبان کی سادگی اور خطابت کے جوش کی بدولت دلوں کو تسخیر کرتا چلا گیا۔

وہ زبانی تقریر کر رہا تھا۔ یادداشت کے لیے کوئی صفحہ، کوئی نوٹ اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ بول رہا تھا، وقت تھم گیا تھا، لوگ ہمہ تن گوش تھے لیکن کچھ آوازیں اس کے اختلاف میں بھی ابھر رہی تھیں۔ "تقریر اچھی رٹی ہے، لکھنے والے نے بڑی محنت کی ہے۔" اس قسم کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان معترضین میں خود صاحب صدر مولانا نذیر احمد بھی شامل تھے۔

آزاد نے تقریر ختم کرتے ہی مولانا نذیر احمد کو مخاطب کیا "جناب صدر سے میری گزارش ہے کہ وہ کوئی موضوع مجھے عنایت فرمائیں۔ حکم ہو تو ابھی تقریر کروں چاہیں تو کل کے اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔"

اس کے اس اعتماد پر سب کو حیرت ہوئی۔ مولانا نذیر احمد

اسی وقت اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ ابوالکلام آزاد کل کے اجلاس میں تبلیغ اسلام کے طریق کار کے موضوع پر ایک مرتبہ پھر تقریر کریں گے۔

دوسرے دن وہ پھر اسی شان سے جائے تقریر پر نمودار ہوا ایک مرتبہ پھر زبانی تقریر کرکے اور موضوع کا حق ادا کرکے حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا۔ لیکچر کے بعد یہ حالت تھی کہ ہر شخص اس سے ملنے کا متمنی تھا۔ مولانا نذیر احمد سب سے زیادہ اس کے گرویدہ تھے اور اسے دہلی آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

انجمن میں ہر جگہ کے لوگ موجود تھے لہٰذا اس ایک کانفرنس سے اس کی شہرت پنجاب کے اکثر شہروں تک پہنچ گئی۔ ہر جگہ سے خطوط آنے لگے۔ بعض مقامات سے لوگ اسے لینے کے لیے کلکتہ آئے اور مختلف شہروں میں اس کے لیکچر رکھے گئے۔

ان تمام فتوحات کے باوجود وہ ایک ایسے ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا کہ اس کے عقائد و اعمال کی پوری دنیا ہل چکی تھی۔ وہ جو چاہتا تھا وہ اس کو مل نہیں رہا تھا' جو موروثی تھا اس پر قانع نہ تھا اور جس کی چاہت تھی' وہ عنقا تھا۔ اقرار و انکار کے درمیان معلق تھا۔

طبیعت کے بہلانے کو نئی مصروفیات ڈھونڈنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ کتابوں کا شوق اسے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا۔ ایک روز کتب فروش نے فقیراللہ خاں سیف کی "راگ درپن" کا ایک نہایت خوش خط اور مصور نسخہ دکھایا۔ آزاد نے وہ کتاب لے لی اور نہایت جاں فشانی سے اس کا مطالعہ شروع کردیا۔ اسے کئی علوم پر مہارت تھی لیکن موسیقی سے کبھی سابقہ پڑا ہی نہیں تھا۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ جب تک کسی ماہر فن سے مدد نہ لی جائے۔ اس کتاب کا سمجھنا مشکل ہے۔ وہ اپنے طور پر کوشش کرتا رہا لیکن یہ واحد علم تھا جس میں اس کا ذہن رسا چند قدم چل کر رک گیا تھا۔ اب اسے کسی ماہر فن کی تلاش تھی۔ اسے مستا خاں کا خیال آیا۔ یہ شخص اس کے والد کا مرید تھا۔ بیعت کے بعد اس نے اس پیشے سے توبہ کرلی تھی۔ آزاد نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ وہ قدرے تذبذب کے بعد تیار ہوگیا کہ مرشد زادے کا حکم ٹالا بھی نہیں جاسکتا۔ ہفتے میں تین دن موسیقی کے درس کے لیے مقرر ہوئے اور پھر وہ ہر روز سہ پہر کے وقت اس کے مکان پر جانے لگا۔ بہت جلد اس نے ستار بجانا سیکھ لیا۔ بین سے بھی انگلیاں آشنا ہوگئیں۔ اس سے بھی زیادہ ایک عالم کی طرح موسیقی کی تاریخ پر نظر ڈالی اور حجاز و مصر کی موسیقی تک کھنگال ڈالی۔

انہی دنوں آگرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اس مرتبہ کتابوں کے بجائے ستار اس کے ساتھ تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کا پچھلا پہر شروع ہونے کو ہوا تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگا۔ رات کا سناٹا' ستاروں کی چھاؤں' ڈھلتی ہوئی چاندنی۔ چاروں طرف "تاج" کے مینارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ وہ تاج محل کی چھت پر چلا گیا اور جمنا کے رخ پر بیٹھ کر ستار چھیڑ دیا۔ ستارے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ "تاج" کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ فریب تخیل کے کیسے کیسے منظر سامنے آئے۔ مینارے جھوم رہے تھے' گنبد باتیں کر رہا تھا' درختوں کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا' علم و ادب کا امام فن موسیقی کا امام بن کر جلوہ گر ہے۔

اس نے کئی مرتبہ سوچا' سب کچھ چھوڑ کر تاج کا مجاور بن جائے لیکن اس کے سوا کچھ بھی نہ ہوا کہ جب تک آگرہ میں رہا' تاج کا امام بنا رہا لیکن پھر اسے گھر لوٹنا پڑا۔ وہ نشے کی اس کیفیت سے مخمور گھر پہنچا تو ایک نیا منظر اس کے استقبال کا منتظر تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے عیسائی پادریوں سے مناظروں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

ہندوستان میں برطانوی استعمار کا ہراول دستہ پادریوں کا تھا۔ انہوں نے ملک میں طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ان کا پہلا مقصد لوگوں کو عیسائی بنا کر اپنی حکومت کے لیے ہندوستانی تیار کرنا تھا۔ دوسرا مقصد سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام سے بدگمان کرنا اور تیسرا مقصد ہندوؤں کے ذہن میں یہ خیال ڈالنا تھا کہ اسلام ان کے ملک میں اجنبی اور جارحانہ طاقت ہے۔ کلکتہ اور بمبئی ان کے دو بڑے مرکز بن گئے تھے۔ یہ مقاصد اس کے نزدیک ایک خطرناک کوشش کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ گھر کے عقائد سے بدظن ہوا تھا' اسلام سے نہیں۔ اسلام پر ان حملوں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اپنی سحر بیانی پر ناز تھا۔ وہ بھی بھائی کے ساتھ شریک ہوگیا بلکہ اس نے یہ مشورہ دیا کہ بمبئی چل کر ان پادریوں کا مقابلہ کیا جائے۔

بمبئی میں مشنریوں کے پر پیچنگ ہال بہ کثرت کھل گئے تھے۔ آریہ سماج کی شاخیں بھی قائم تھیں اور چند مشہور اسپیکر باہر سے آئے ہوئے تھے۔ پنجاب کے ایک شخص منصور مسیح تھے۔ فارسی و عربی کی استعداد تھی۔ انہوں نے بھی ایک پریچنگ ہال قائم کر رکھا تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ جلسے

ہوتے تھے اور مسلمانوں کو چیلنج دیے جاتے تھے۔

بمبئی کے تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگ اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ تھے البتہ عام مسلمانوں میں سے چند آدمیوں نے ایک انجمن "ضیاء الاسلام" بنا رکھی تھی۔ اس کے بھی ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے پہنچنے کے بعد اس انجمن میں جان پڑ گئی خصوصاً آزاد کی شعلہ بیانی شہر بھر کی آبادی کو ان جلسوں میں کھینچ لائی۔ ایک دو مباحثوں نے تو اتنا طول پکڑا کہ کئی ہفتے تک جاری رہے۔ سامعین کا مجمع اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ کئی بار سڑک کی آمد و رفت رک گئی۔

ان مناظروں میں جس قدر مخالفین اسلام کے مشہور اعتراضات ہیں وہ سب معرضِ بحث میں آتے تھے۔ ان مناظروں کی تیاری کے لیے اس نے بائبل کا مکمل مطالعہ کیا اور مسیحی مصنفین کی تفاسیر و شروح سے جس قدر واقفیت حاصل کی جاسکتی تھی' حاصل کی۔ اس کے مذہبی خیالات میں پہلے ہی کھلبلی مچی ہوئی تھی' اس لیے قطع نظر ضرورتِ مناظرہ خود بھی طبیعت میں طلب و جستجو تھی جو اسے زیادہ سے زیادہ مطالعے پر مجبور کر رہی تھی۔ قدیم و جدید مسیحی متکلمین کے جتنے اسکول ہیں اور مختلف مشرب کے مفسرین عہد قدیم و جدید نے جو کچھ لکھا ہے' وہ سب اس نے پڑھ لیا۔

مشہور ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری بھی ان مناظروں میں شریک ہوتے تھے۔ علم تو اتنا نہیں تھا لیکن بلا کے بولنے والے تھے اور پادریوں کو چٹکیوں میں اڑاتے تھے۔

آزاد کو نیا نیا موسیقی کا شوق ہوا تھا لہٰذا آغا حشر سے اس کی دوستی ہوتے دیر نہیں لگی۔ آغا حشر کے شامل ہوتے ہی ان مناظروں میں تیزی آگئی۔ تینوں نے مل کر پادریوں کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ پادری انہیں دیکھ کر بھاگنے لگے۔ ان کا یہ حال کہ جہاں پادری ہوتے یہ وہاں پہنچ جاتے اور انہیں مختلف مباحث میں الجھا دیتے' وہ اتنے تنگ ہوئے کہ آخر کار انہوں نے ان نوجوانوں کے خلاف گورنر بمبئی سے شکایت کی کہ ان لوگوں میں عیسائیت اور سلطنت دونوں کے خلاف سخت قسم کے معاندانہ خیالات پائے جاتے ہیں جس سے مسلمانوں کی وفاداری کے متزلزل ہونے کا اندیشہ ہے۔

ان مناظروں سے عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا لیکن اس سے زیادہ خود آزاد کو فائدہ پہنچا۔ آریہ سماج' بندو دھرم اور مسیحیت کی تعلیمات سے اس کی واقفیت ہوئی۔ یہ بھی مطالعے کی ایک صورت تھی۔

اس کی فطرت نے پھر رنگ دکھایا۔ کچھ دنوں بعد ان مناظروں سے اس کا جی بھر گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ کھینچ لیا۔ پادریوں کا زور بہت کچھ ٹوٹ بھی گیا تھا۔

اس کے کچھ دن بعد ہی وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ عراق چلا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کے علما سے مزید تعلیم حاصل کی جائے گی۔ وہاں جا کر وہ کچھ دنوں درس میں شریک بھی ہوا لیکن اس کا دل اکھڑ گیا۔ بڑے بھائی تو وہیں رک گئے' وہ واپس آگیا۔

گھر میں کشیدگی کی فضا بدستور جاری تھی۔ والد چاہتے تھے' وہ ان کی جانشینی اختیار کرے لیکن وہ نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلے کا سرے سے قائل ہی نہیں رہا تھا۔ تقلیدِ رسوم اس کی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ وہ تو اس وقت دہری زندگی گزار رہا تھا۔ ظاہری طور پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا... جیسے وہ مذہب کو عقل و علم کے تابع رکھنا چاہتا ہے لیکن اندر سے خود مذہب کی طرف سے بے زاری کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر گھر سے دور بلکہ والد سے دور رہنے کے لیے بمبئی آگیا۔

بمبئی پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شبلی نعمانی بمبئی آئے ہوئے ہیں اور ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ برسوں کی دبی ہوئی خواہش نے سر ابھارا۔ شبلی سے اس کی خط و کتابت تو کئی سال سے تھی لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اس شہر میں تھا جہاں شبلی بھی موجود تھے۔ اس کی عمر اب بھی محض سترہ سیڑھیاں طے کر سکی تھی لیکن مطالعے کی کثرت اور تفکراتِ علمی نے چہرے کو پختہ کر دیا تھا۔

بمبئی کے علاقے بائی کلہ کے ایک ہوٹل کے ایک کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہی وہ کھڑکی تھی جو اس کمرے میں کھلتی تھی جہاں شبلی ٹھہرے ہوئے تھے۔ نیچے ٹریفک شور مچا رہا تھا لیکن اندر سکوت تھا۔

آزاد تانگے سے اترا اور گردن اٹھا کر ہوٹل کو دیکھنے لگا۔ انہی کمروں میں سے کسی ایک کمرے میں وہ شخصیت موجود ہوگی جو علم الکلام اور الکلام جیسی کتابوں کا مصنف ہے۔ وہ دھڑکتے دل سے ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ مولانا کو اطلاع کر دی گئی کہ ابوالکلام ان سے ملاقات کا غرض مند ہے۔ مولانا شبلی اس نام سے نا آشنا نہیں تھے' فوراً طلبی ہو گئی۔

مولانا شبلی اپنے کمرے کے دروازے پر ایک نوعمر لڑکے کو دیکھ کر چونکے ضرور لیکن اپنی حیرت ظاہر کر کے وہ یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ نووارد کی آمد انہیں ناگوار ہوئی ہے لیکن

انہیں اس پر غصہ ضرور تھا کہ اس لڑکے نے کسی اور کے نام کا سہارا لے کر ملاقات کا بہانہ ڈھونڈا ہے۔ وضع داری کا تقاضا تھا کہ مہمان سے خوش اخلاقی سے باتیں کی جائیں لیکن ان کی بے دلی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ آزاد پر بھی ان کے اس رویے کا اچھا اثر نہیں ہوا تھا لہٰذا دس پندرہ منٹ بعد ہی اس نے اجازت چاہی۔ مولانا اسے چھوڑنے کمرے کے دروازے تک آئے۔ چلتے وقت وہ اس سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

"ابوالکلام آپ کے والد کا نام ہوگا؟"

"جی نہیں، میں خود ہوں۔"

"آپ ہیں؟ آپ ابوالکلام آزاد ہیں؟"

آزاد نے اثبات میں گردن ہلائی تو شبلی نے اس کا بازو تھام لیا "تو یوں کہو نا، میں نے کسی بدگمانی میں تم سے باتیں ہی نہیں کیں۔ دراصل مجھے تمہاری عمر نے دھوکا دیا۔ اب سب بات صاف ہوگئی۔"

اس کے بعد وہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو امام رازی کا تذکرہ نکل آیا۔ آزاد نے امام موصوف کی "محصل الافکار" کا ذکر کیا۔ مولانا اس پر چونکے۔

"اگر یہ چھپ گئی ہوتی" شبلی نے حسرت سے کہا۔

"یہ تو چھپ چکی ہے" آزاد نے کہا اور اس کے مندرجات پر اچھی خاصی تقریر بھی کر ڈالی لیکن مولانا کے علم میں نہیں تھا کہ چھپ چکی ہے۔ انہیں یہ ماننے میں تامل تھا۔

"اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے۔ میں ملاحظے کے لیے آپ کو پیش کر سکتا ہوں۔"

"جب تک میں دیکھ نہیں لوں گا مجھے یقین نہیں آئے گا۔ کل تم آؤ اور وہ نسخہ ساتھ لے کر آؤ۔"

اتفاق سے وہ نسخہ، وہ مطالعے کی کتابوں میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس لیے اس نے وعدہ کر لیا اور خوش بھی ہوا کہ ایک ملاقات کا موقع اور مل گیا۔

وہ وہاں سے اٹھا تو مولانا اس کے مطالعے کے شوق کے قائل ہو چکے تھے۔ یہ بھی جان گئے تھے کہ یہ لڑکا معمولی ذہن کا نہیں ہے۔

دوسرے دن وہ ہوٹل پہنچا تو دیکھا کہ ایک بحث بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ اس وقت وہاں مولوی نظام الدین بیٹھے تھے جن کا نام آزاد کو بعد میں معلوم ہوا۔ ایک اور شخص علی محمود موجود تھے جن سے آزاد واقف تھا۔

جس وقت آزاد کمرے میں داخل ہوا، شبلی نعمانی علی محمود سے مخاطب تھے "فنِ مناظرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کی گفتگو کس قدر بے اسلوب ہوتی ہے" رشیدیہ" اس سلسلے میں اچھا متن ہے۔"

رشیدیہ کے بعض مطالب، مولانا علی محمود کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن مولوی نظام الدین بار بار الجھ پڑتے تھے اور کج بحثی پر اتر آتے تھے۔ مولانا شبلی نے سمجھانا چاہا لیکن کج بحثی بڑھتی گئی۔

آزاد اب تک خاموش بیٹھا تھا حالانکہ یہ اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ نیا نیا مطالعہ تھا اور درسیات خوب اچھی طرح اس کے حافظے میں تھیں۔ بالآخر اس نے مولوی نظام الدین کو مخاطب کیا اور جو باتیں باعثِ نزاع ہو رہی تھیں، ان کی وضاحت کی۔

وہ کسی لمبی چوڑی بحث کرنے کے حق میں نہیں تھا لیکن اس کے بیان کردہ چند نکتے سن کر شبلی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا، اپنی تقریر پوری کرو۔ اشارہ ملنے کی دیر تھی۔ اس نے ایک بسیط تقریر کر ڈالی۔ وہ اعتراضات بھی اٹھائے جو مولوی نظام کے ذہن میں بھی نہیں آئے ہوں گے اور پھر خود ہی ان کا رد کیا۔

وہ تقریر ختم کر چکا تو شبلی حد درجہ متاثر ہوئے "تمہارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک نمونے کے پیش کرنا چاہیے۔"

آزاد کے نزدیک یہ بحث کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی لیکن شبلی کی حد درجہ حوصلہ افزائی نے ایسا مسحور کیا کہ کئی دن تک وہ اس کی سرشاری میں گھومتا پھرا۔

اس حوصلہ افزائی کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ ہر ملاقات میں اس کی کوئی نہ کوئی صفت مولانا پر ظاہر ہوتی چلی گئی اور وہ اس سے حد درجہ مانوس ہو گئے۔

دارالعلوم ندوہ کی طرف سے حکومت کی بدگمانیاں جب بہت بڑھنے لگی تھیں تو محسن الملک کے مشورے سے انہوں نے حیدر آباد دکن کا رخ اختیار کیا تھا اور سید بلگرامی کی کوششوں سے انہیں سلسلۂ آصفیہ کے سررشتہ علوم و فنون کا عہدہ مل گیا تھا۔ یہاں کے قیام کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم وغیرہ جیسی اہم کتابیں لکھیں۔ اس دوران میں ندوہ کے کام بھی کرتے رہے۔ ندوہ کی طرف سے ہونے والے جلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ اسی زمانے ۱۹۰۴ء میں یہ طے ہو چکا تھا کہ ندوہ کا ترجمان ایک رسالہ "الندوہ" جاری کیا جائے۔

آزاد سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ حیدر آباد میں قیام پذیر تھے اور وہیں سے بیٹھ کر ندوہ کے کاموں کی نگرانی کر رہے

تھے اور اب کسی کام کے سلسلے میں بمبئی آئے ہوئے تھے۔

بمبئی کے قیام میں وہ آزاد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے اپنے ساتھ حیدر آباد لے جانے کے خواہش مند تھے۔ آزاد نے اس وقت تو اس پیشکش پر توجہ نہیں دی لیکن اس کے بعد جب حیدر آباد سے ان کے مسلسل خطوط آنے لگے تو وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اس وقت اس کے مطالعے کا یہ عالم تھا کہ عربی، فارسی اور اردو کی تمام نئی مطبوعات تقریباً اس کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ مولانا اس کی اسی خوبی کے قائل تھے اور بارہا کہہ چکے تھے کہ اس قدر علم و فضل کے ہوتے ہوئے یہاں کیوں ہو۔ حیدر آباد آجاؤ۔

گھر کی زندگی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اس لیے یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ ایک ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آرہی ہے تو چلا جانا چاہیے لیکن بعض وابستگیاں ایسی تھیں کہ وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

اسی دوران میں شبلی نے ریاست حیدر آباد کی ملازمت ترک کردی اور انہیں دارالعلوم کا معتمد تعلیم مقرر کردیا گیا۔ اب ان کا مستقل قیام لکھنؤ میں تھا۔ اب پہلے سے بھی زیادہ انہیں آزاد کی ضرورت تھی۔ ادھر رسالہ "الندوہ" بھی جاری ہوچکا تھا۔ اب ان کے خط آنے لگے کہ لکھنؤ پہنچو اور جلد پہنچو۔

"لسان الصدق" بند ہوچکا تھا۔ کوئی علمی شغل ہاتھ میں نہیں تھا۔ گھریلو حالات بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ گھر سے دور مولانا کے پاس لکھنؤ چلا جائے۔ حیدر آباد کے مقابلے میں لکھنؤ سے وہ مانوس بھی تھا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت کرنے لکھنؤ جاتا رہا تھا لہٰذا اس نے قطعی فیصلہ کرلیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔

لکھنؤ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ مولانا اپنی اہلیہ کی علالت کی خبر سن کر اعظم گڑھ چلے گئے ہیں۔ وہ بھی اعظم گڑھ چلا گیا کہ اس مصیبت میں وہ مولانا کو سہارا دے۔ اتفاق سے وہ جس دن پہنچا، اسی دن ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

چند روز موت کے گھر میں صدمے کا قیام رہا۔ تعزیت کرنے والوں سے فرصت ملی تو وہ مولانا کے ساتھ ہی لکھنؤ آگیا۔ مولانا گولہ گنج لاہور میں مقیم تھے، اسے بھی ان کے ساتھ ہی ٹھہرنا تھا۔

اس کا طرزِ تحریر، اس کے سوچنے کا انداز، اس کی ذہانت و قابلیت ایسی تھی کہ مولانا کی خلوت و جلوت کا ساتھی بن گیا۔ اس ہیرے کو چمکانے کے لیے انہوں نے اسے اپنے ساتھ رکھا۔ یہاں تک کہ اسے "الندوہ" کی ایڈیٹری سونپ دی۔

یہ خالص علمی، مذہبی اور تحقیقاتی پرچہ تھا اور ندوۃ العلما کا آرگن ہونے کی وجہ سے اس کی ایڈیٹری بڑی ذمے داری کا کام تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ شبلی جیسا نابغۂ روزگار اس کا ایڈیٹر تھا اور آزاد کی اہمیت کا اندازہ اہلِ ہندوستان کو اس بات سے ہوا کہ شبلی نے اپنی جانشینی کا فریضہ اسے سونپا۔

اس پرچے کا خطاب عوام سے نہیں، علمائے وقت سے تھا۔ مصنفین میں بھی محقق اور اسکالرز تھے۔ سترہ سال کی عمر میں ایک ایسے پرچے کا مدیر ہوجانا باعثِ اعزاز بھی تھا اور باعثِ رشک و حسد بھی۔

اس کا قیام شبلی کے ساتھ تھا۔ دن رات کی یک جائی تھی۔ عمروں میں فرق تھا لیکن علمیت میں برابری کا تعلق تھا لہٰذا دونوں کے درمیان ایسی بے تکلفی ہوگئی جو عزیز ترین شاگردوں اور دور کے ملنے والوں کو نصیب نہیں تھی۔ یہی بے تکلفی دوسروں کے لیے حسد کا باعث بنتی تھی۔ برسوں کی خدمت کے بعد بھی لوگوں کو وہ قربت نصیب نہ ہوسکی تھی جو اس نے اپنی اہلیت کی بنیاد پر شبلی کی محفل میں حاصل کرلی تھی۔

حسد کے جذبات تو برداشت کرلیتا لیکن جب حاسدوں کی زبان چلنے لگی اور اس کی طرف سے شبلی کی شیفتگی کو طرح طرح کے معنی پہنائے جانے لگے تو اس نے یہی غنیمت جانا کہ اس منزل کو بھی خیرباد کہہ دے۔

یہ پرچہ "الندوہ" مذہبی نوعیت کا تھا اور مذہب کی طرف سے اس کے دل میں شک پیدا ہوچکا تھا۔ اس لیے بھی اس کا یہاں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کھل کر نہیں کرسکتا تھا۔ یہ مجبوری اسے عمر کے کسی دور میں بھی پسند نہیں رہی تھی۔ غرض کہ کئی باتیں تھیں جو اسے الندوہ چھوڑ دینے پر اکسا رہی تھیں۔ شبلی کی محبت میں وہ یہاں تک آتو گیا تھا لیکن اب وہ یہاں سے جانے کے لیے سوچ رہا تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں اس کی ملاقات سہ روزہ اخبار وکیل کے مالک شیخ غلام محمد سے ہوئی تھی۔ یہ اخبار امرتسر سے نکلتا تھا اور اشاعت کے اعتبار سے اردو کے اخباروں میں سب سے بڑا اخبار تھا۔ شیخ غلام محمد اس کے پرستاروں میں سے تھے۔ وہ ان کے اخبار میں مضامین لکھتا رہا تھا جبکہ وہ چاہتے تھے، آزاد ان کے اخبار سے وابستہ ہوجائے۔ اس سلسلے میں ان کے خط آتے رہتے تھے لیکن وہ شبلی کے دامنِ علم سے وابستہ تھا۔ اس دسترخوان سے اٹھ کر

کہیں اور جانا نہیں چاہتا تھا۔

جب حالات بدلے اور اس نے الندوہ کو چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تو اسے اخبار "وکیل" کا خیال آیا۔ انہی دنوں شیخ غلام محمد کا ایک خط اور آیا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا' حامد علی صدیقی جو ایڈیٹر تھے' ملازمت چھوڑ گئے ہیں۔ اس وقت کوئی ایڈیٹر نہیں' میری خواہش تھی کہ آپ آجاتے۔ اگر آپ آجائیں تو میں اخبار بالکل آپ کے سپرد کردوں اور پوری آزادی سے آپ اپنے خیالات ظاہر کرسکتے ہیں۔

اس نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر خود کوئی اخبار نکالا جائے تو اس کو ایک وسیع حلقہ پیدا کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ اس کے برخلاف اگر ایک مقبول اخبار اپنے اختیار میں آجائے تو پہلے دن ہی سے اچھا حلقہ پڑھنے والوں کا میسر آجائے گا۔

لکھنؤ میں اس کا دل لگ گیا تھا۔ اگر ایک طرف شبلی کی علمی صحبتیں تھیں تو دوسری جانب مرزا ہادی رسوا کی وساطت سے اس کے موسیقی کے شوق کو غذا مل رہی تھی۔ مرزا ہادی رسوا کے مکان میں شاہدانِ نغمہ پرواز جمع ہوتے تھے۔ ان جور شمائلوں کی موجودگی میں ستار پر انگلیاں خود بخود چلنے لگتی تھیں۔ عمد شباب تھا۔ یہ سب اچھا لگتا تھا۔ یہ صحبتیں ایسی تھیں کہ لکھنؤ اس کے لیے بہشت بریں بنا ہوا تھا لیکن اس سے بھی بڑا مقصد اسے آواز دے رہا تھا۔ اس نے پھولوں کی ان زنجیروں کو توڑا اور لکھنؤ سے چل کر امرتسر پہنچ گیا۔

اسی وقت سرِدست اس کا مقصد یہ تھا کہ شیخ غلام محمد کی مدد کی جائے کیونکہ ان کا ایڈیٹران کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے عارضی طور پر اخبار کو ترتیب دینا شروع کردیا لیکن رفتہ رفتہ اس کی طبیعت لگنا شروع ہوگئی۔ اس نے رائے قائم کرلی کہ کچھ دن اس عالم کی سیر بھی کرنی چاہیے۔

چند ہفتوں بعد اس نے ایڈیٹری کی پوری ذمے داری قبول کرلی۔ کام سنبھالتے ہی اس نے چند ایسی خوش گوار تبدیلیاں کیں جو اس اخبار کی مقبولیت اور اشاعت کے اضافے کا سبب بنیں۔

اس کی آمد سے قبل یہ اخبار ہفتے میں تین مرتبہ نکلتا تھا اور دفتر میں بجز ایک مترجم کے اور کوئی مددگار نہ تھا۔ عموماً ایک ڈیڑھ کالم کا لیڈنگ آرٹیکل اور ایک کالم کے بریف نوٹس ہوا کرتے تھے۔ باقی مراسلات و اقتباسات۔

اس نے معیار بلند کرنے کے لیے اخبار کو ویکلی کردیا اور ضخامت بڑھادی۔ دو کالم کی جگہ کم سے کم چار کالم کا ایڈیٹوریل کردیا۔ مراسلات و اقتباسات کے انتخاب کا معیار بھی بلند کردیا۔ علمی و تاریخی مقالات بھی اخبار کی زینت بنانے لگا۔ یہ سب کام اسے اکیلے کرنا پڑتے تھے لیکن صحافت اس کا مشغلہ تھا۔ ہر تفریح اور آرام کو بھول کر وہ اس ذمے داری کو پورا کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد سخت بیمار پڑ گیا۔ قلم رکتا تو اخبار رک جاتا۔ وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے کام کرتا رہا اور اخبار کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔

اس کی محنت رنگ لائی اور "وکیل" کی اشاعت ڈیوڑھی بڑھ گئی۔ اس کے مباحث اور علمی و ادبی رنگ کی ترقی کو عوام نے شدت سے محسوس کیا۔

اسی عالم بے خبری میں ایک سال گزر گیا۔ ۱۹۰۶ء کے وسط میں یہ روح فرسا خبر آئی کہ اس کے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ وہ عراق میں تھے کہ بیمار ہوئے' اسی بیماری کی حالت میں وہ کلکتہ پہنچے۔ کسی علاج نے ان کی صحت کو سنبھالا نہیں دیا اور بالآخر صرف ۴۱ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

اس خبر نے اسے بوکھلا دیا۔ بڑا بھائی صرف بھائی نہیں تھا' دوست بھی تھا۔ ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی' مشاعرے پڑھے تھے' مناظرے کیے تھے۔ ایک ایک منظر آنکھوں کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگا۔ وہ آنسوؤں کی دھند کے اس پار ایک ایک منظر کو دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ والد کا خط آگیا۔ وہ اب بھی گھر جانے کو تیار نہیں تھا۔ ایک خط پھر آگیا "جلدی آؤ اور کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ" وہ پھر طرح دے جاتا لیکن اس خط کے بعد مولانا خیرالدین نے کلکتے سے دو آدمی اسے لانے کے لیے بھیج دیے۔ انہوں نے والد کی پریشانی کا نقشہ ایسے لفظوں میں کھینچا کہ وہ تڑپ گیا۔ واقعی' ہم دو بھائی ہی تو تھے۔ ایک رخصت ہوگیا' دوسرا گھر سے غائب ہے۔ بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ حضرت کتنے اکیلے رہ گئے ہوں گے۔ اسے اپنی کوتاہی پر غصہ آنے لگا۔ وہ جیسا بیٹھا تھا' اسی طرح کلکتہ جانے کے لیے روانہ ہوگیا۔

گھر میں اُداسی پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا خیرالدین علیل تھے اور بہت کمزور ہوگئے تھے۔ بینائی تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ بیٹے کے دکھ میں گھل کر رہ گئے تھے۔ استقامت کے پہاڑ میں دراڑیں پڑچکی تھیں۔ آزاد ان کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

آزاد کو کلکتہ آئے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ مولانا خیرالدین نے اسے طلب کیا "میری حالت تم دیکھ رہے ہو۔ میرا چراغِ حیات کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ ابوتراب اس دنیا میں نہیں رہا ورنہ یہ بات میں اس سے کہتا" یہ کہتے کہتے ان کی آواز بیٹھ گئی۔

آزاد بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب وہ اپنے جذبات پر قابو پائیں اور سلسلہ کلام پھر جاری ہو۔ مولانا خیرالدین نے اپنی آواز بلند کی "میں چاہتا ہوں تم اپنی سیاحت ترک کرو اور میری جانشینی اختیار کرو۔ میرے بعد میرے مرید تمہی سے رجوع کریں گے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے، مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں۔"

آزاد کوئی جواب دے کر ان کی دل شکنی نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش تھا۔ مولانا یہ سوچ رہے تھے کہ عادت کے مطابق جواب دینے کی جسارت نہیں کر رہا ہے۔

"بمبئی میں جو ائمداد ہے، اب اس کی دیکھ بھال بھی تمہی کو کرنی ہے۔"

انہوں نے گویا اپنے دل میں طے کرلیا تھا کہ آزاد ان کی پہلی بات مان چکا ہے۔ اسی لیے انہوں نے دوسری ہدایت جاری کی تھی جبکہ آزاد یہ سوچ رہا تھا کہ لفظوں کا سہارا لے کر معذرت کرلے۔

"مریدوں کی تربیت اور پند و وعظ میرے ذوق میں شامل نہیں۔ اس لیے شاید یہ کام مجھ سے نہ ہوسکے" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ذوق میں شامل نہیں یا تیرے خیالات بگڑ چکے ہیں؟"

"مجھے پسند نہیں کہ کوئی میرے ہاتھ چومے اور مبالغے کے ساتھ میری تعظیم کرے جبکہ میں اس کا اہل بھی نہیں۔ میری منزل تو کتب و رسائل ہیں۔ مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ بھائی ہوتے تو یقیناً وہ آپ کے سچے جانشین ہوتے۔"

"تو وہابی ہوگیا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کیا ہوگیا ہوں۔ شاید کچھ بھی نہیں یا شاید کچھ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"سرسید کی تقلید چھوڑ دے ورنہ دنیا بھی خراب ہوگی اور آخرت بھی۔"

"ایک سرسید پر ہی کیا منحصر ہے۔ میں نے بہت سے اہم لوگوں کو اسی مذہب پر پایا جس پر میں ہوں۔"

"تم نے مذہب کو غلط سمجھا۔"

"میں نے کب کہا، میں نے حقیقت کو جان لیا ہے۔ میں تو ابھی طالب علم ہوں لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر آبائی عقائد کو درست پایا تو اپنی رائے سے رجوع کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"جب پہلا قدم ہی غلط اٹھا ہے تو راہِ راست پر کبھی نہ آسکو گے۔ اب تم جاسکتے ہو۔ جو جی چاہے کرو۔ جس میں تمہیں تسکین ملتی ہو، وہ کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

اسے افسوس تو بہت ہوا کہ اس نے ایسے شفیق باپ کی خواہش کو ٹھکرا دیا لیکن اس کے قدم جس راہ پر اٹھ چکے تھے، اب رک نہیں سکتے تھے۔ کئی دن کے افسوس کے بعد وہ پھر بحال ہوگیا۔

وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ عزت، دولت، شہرت سب اس کے خاندان میں جمع تھی۔ وہ اگر چاہتا تو باپ کا جانشین بن کر یہی چیزیں اپنے لیے حاصل کرسکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہتا رہا کہ مریدوں کے نذرانوں سے شاہی ٹھاٹ باٹ تو حاصل ہوسکتے ہیں لیکن فقر و استغنا کی دولت نہیں مل سکتی۔ وہ تصوف کا مخالف نہیں تھا لیکن اس کے جو مظاہر دیکھ رہا تھا، اس کے خلاف تھا۔ اس نے اپنے نظریات کی حفاظت کے لیے زندگی بھر کا عیش ٹھکرا دیا۔ زندگی بھر کی سہولت کو صحافت کے خارزار پر قربان کردیا۔ رشتے داروں نے سمجھایا، دوستوں نے مشورہ دیا لیکن اس نے اپنی منزل کا انتخاب کرلیا تھا۔

○☆○

ہندوستان اس وقت آزادی کی آگ میں جل رہا تھا اور تشدد کے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ کوئی قومی قیادت ایسی نہیں تھی جو اس طوفان کو روک سکتی۔ کانگریس موجود ضرور تھی لیکن ابھی تناور درخت نہیں بنی تھی۔ انگریزوں کی طرف سے اس کا رویہ مصالحانہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا فیصلہ کیا تو گویا ہمیشہ کے لیے ہندو، مسلم اختلاف کا بیج بودیا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندو نوجوانوں میں زبردست تشدد اور انقلاب کا جوش پیدا ہوا اور سیاست، انقلاب کے راستے پر چل پڑی۔ کلکتہ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے انقلابیوں کا گڑھ بن گیا تھا چنانچہ شری آربندو گھوش بڑودہ سے کلکتہ آگئے تاکہ اس شہر کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں۔ ان کا اخبار "گرم لوکن" قومی بیداری کا نشان اور غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کا جھنڈا بن کر لہرانے لگا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں انقلابیوں کے خفیہ اجلاس ہوتے تھے اور تشدد کے منصوبوں پر غور ہوتا تھا۔ بم سازی کے مراحل یہیں طے ہوتے تھے۔

مسلمان ان انقلابیوں سے دور تھے لہٰذا یہ انقلابی بھی مسلمانوں کو اپنا صریح دشمن تصور کرنے لگے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی لکیر مزید گہری کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک اور چال چلی۔ اس نے پولیس کے خفیہ محکموں سے ہندوؤں کی چھانٹی کرکے یوپی اور بہار

کے مسلمانوں کا تقرر کیا۔

یہ حالات تھے جب وہ امرتسر سے کلکتہ آیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف بارود کی بُو محسوس کی اور ساتھ ہی برطانوی سازش کے اس حصے کو بھی سمجھا کہ ایک پلان کے تحت مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑانے کی تیاریاں ہیں۔ تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں انہیں حصہ لینے سے روکا جارہا ہے جبکہ اس وقت اس کے خیال میں انقلاب ہی آزادی کا واحد راستہ تھا۔

شری شیام سندر چکرورتی سے اس کی ایک دو ملاقاتیں کبھی ہوئی تھیں اور ان دنوں وہ بھی کلکتہ میں تھے۔ چکرورتی انقلابیوں میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان سے ملاقات کے بعد اس کے خیالوں میں مزید روشنی آئے گی۔ وہ ان سے ملنے کی کوشش کرنے لگا اور بالآخر ایک روز وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے چند ساتھیوں نے آزاد کو ایک محفوظ مقام پر پہنچادیا جہاں چکرورتی موجود تھے۔

"آیئے مولانا۔ ہم دہشت پسندوں سے ملنے کا خیال کیسے آگیا۔"

"مولانا کہہ کر آپ مجھ پر طنز کررہے ہیں۔ میں نے تو اپنے نام کے ساتھ کبھی مولانا نہیں لکھا۔"

"آپ نہ لکھیں لیکن میرے نزدیک تو ہر مسلمان' مولانا ہے۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو' یہ فرمایئے کیسے آنا ہوا؟"

"کسی قوم کا باسی' قوم کے نجات دہندہ کے پاس کیوں آتا ہے؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں" چکرورتی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ آپ لوگوں کے دل مسلمانوں کی طرف سے صاف نہیں ہیں۔"

"انہوں نے خود ہی اپنا راستہ الگ کیا ہے اور برطانوی سامراج اس سے فائدہ اٹھارہا ہے۔"

"میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے ساتھ مل کر کام کروں تاکہ آپ کی غلط فہمی دور ہو۔ میں یہ بھی کوشش کروں گا کہ دوسرے مسلمانوں بھی ہمارے ساتھ کام کرسکیں۔"

"آپ کا میدان تو مذہب ہے۔ آپ اس خارزار میں کیوں آرہے ہیں۔"

"میرے بھائی' مذہب اور سیاست میرے نزدیک الگ الگ چیزیں نہیں۔ موجودہ حالات میں میرا نظریہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ نہ تو وہ برطانوی حکومت پر اعتماد کریں نہ غیراللہ کی طاقت پر۔ انہیں کلمۂ حق بلند کرنا چاہیے۔ ظالم و جابر کے سامنے نہ جھکنے کا فلسفہ تو ہے مسلمانوں کا۔ ہمارے یہاں جہاد اسی کا نام ہے کہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میرا مذہب مجھے سیاست کی طرف آنے سے روکے گا۔"

"لیکن ہم سیاست پر نہیں' تشدد پر یقین رکھتے ہیں" چکرورتی نے کہا۔

"یہ وقت کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے فلسفۂ تشدد سے متفق ہوں۔"

"کاش! ہر مسلمان یہی سوچ رہا ہوتا۔"

"یہی سوچ رہا ہے لیکن ان کے پاس لیڈرشپ نہیں ہے۔ اس کمی کو میں پورا کروں گا۔"

"مولانا آزاد' ایک بات میں بتادوں" چکرورتی نے کہا اور اس پر نظریں جمادیں "اگر آپ کسی کے گماشتے بن کر آئے ہیں تو آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب آپ دوبارہ آئیں گے تو میں یہاں نہیں ملوں گا۔ ہمارے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔"

"مجھے آپ کی بات کا قطعی افسوس نہیں ہوا کیونکہ موجودہ حالات میں ایک مسلمان کی طرف سے آپ کو یہی بدگمانی ہونی چاہیے تھی لیکن آپ یقین کریں' مجھے کسی نے نہیں بھیجا اور نہ یہاں سے جانے کے بعد کسی سے کہوں گا کہ میں کس سے مل کر آیا ہوں۔ میں انقلابی تحریک میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ یہ ملک آپ ہی کا نہیں' میرا بھی ہے۔ غلام آپ ہی نہیں' میں بھی ہوں۔ آزادی آپ ہی کی نہیں' میری ضرورت بھی ہے۔"

"آپ نے مجھے قائل کرلیا لیکن میرے ساتھی آپ کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے۔"

"میں انتظار کرلوں گا لیکن وہ یہ دیکھ لیں گے کہ میرے بعد کتنے مسلمان اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ ہم ہندو' مسلم کی تفریق مٹاکر ہی اس تحریک کو کامیاب بناسکتے ہیں۔"

"ویل ڈن' مسٹر آزاد!"

"اس مرتبہ آپ نے مولانا نہیں کہا؟"

چکرورتی جھینپ کر رہ گئے "آپ کے مشوروں سے ہم ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔"

اس ملاقات کے بعد اس نے کئی ملاقاتیں اور کیں۔ شری آربندو گھوش سے بھی ملاقات کی اور اسے اس تحریک میں شامل کرلیا گیا۔

شیام سندر چکرورتی کے توسط سے وہ اور انقلابیوں سے

بھی ملا اور ان کے طریقۂ کار کو قریب سے دیکھا۔ ہتھیاروں کی ترسیل کے نظام پر غور کیا اور ان کے کوڈ ورڈز سے آگاہی حاصل کی۔

ابتدا میں انقلابیوں کو اس پر بھروسا نہیں تھا اس لیے اسے خاص اجلاسوں سے دور رکھا جاتا تھا لیکن جلد ہی اس نے اعتماد حاصل کرلیا اور خفیہ اجلاسوں میں شریک ہونے لگا۔

انقلابیوں کے تمام کام نہایت رازداری سے ہوتے تھے۔ بہت سے لوگ ان انقلابیوں کے لیے کام کررہے تھے' مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کررہے ہیں۔ آزاد کا حال بھی یہی تھا۔ اس پر کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ بنگالی انقلابیوں کے لیے کام کرنے لگا ہے۔

وہ جب ان خفیہ اجلاسوں میں شریک ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ انقلابی سرگرمیاں صرف بنگال اور بہار تک محدود ہیں۔ اس نے ان اجلاسوں میں سب سے پہلے اس ضرورت پر زور دیا کہ انقلابی جماعت کے دائرے کو وسیع کیا جائے تاکہ انتظامیہ کی توجہ منتشر ہوسکے۔ اس کی کوششوں سے شمالی ہندوستان کے کئی بڑے شہروں میں اور بمبئی میں انقلابیوں کی خفیہ انجمنیں بن گئیں۔ آزاد اپنے ذاتی تعلقات اور مشوروں سے اس تحریک کو ایندھن فراہم کررہا تھا۔

ہندوستان ہی میں نہیں پورے بلاد اسلامیہ میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ استعماری قوتیں ہر جگہ ظلم کے پنجے گاڑے ہوئی تھیں۔ اب آزاد بھی انقلابی گروپ میں شامل ہوچکا تھا لہٰذا لازمی طور پر اسے ان گروپوں سے ہمدردی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ اپنی تحریک کن خطوط پر چلا رہے ہیں۔ پھر اس کی پیروی ہندوستان میں بھی کی جائے۔ اس نے سامانِ سفر باندھا اور عراق پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ انقلابیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور پھر وہ عراقی انقلابیوں سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔ مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے پیروؤں سے تعلقات پیدا ہوئے۔ اس سفر میں وہ ینگ ٹرکس کے گروپ سے بھی ملا۔ انہوں نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتے تھے۔

ان انقلابیوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان قومی مطالبوں کی طرف سے بے اعتنائی اور سرد مہری برتتے یا ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی جنگ میں رہبروں کا کام کرنا تھا نہ کہ انگریزوں کے بیرے بن کر رہ جانا۔

ان ملاقاتوں کے بعد اس کا عقیدہ اور بھی راسخ ہوگیا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت و معاونت کرنا چاہیے اور اس کی تدبیر کرنی چاہیے کہ برطانوی حکومت اپنے اغراض کے لیے انہیں ناجائز طور پر استعمال نہ کرسکے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ہندوستان واپس جاکر زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی جدوجہد کرے گا۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد اس نے از سرِ نو غور کرنا شروع کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اخبار ہی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اپنا اخبار نکالنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ اسے ایک مرتبہ پھر اخبار "وکیل" کی یاد آئی۔ شیخ غلام محمد تو جیسے اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پہلے ہی خط کے جواب میں انہوں نے اسے بلالیا۔

اس عرصے میں اس کے طرزِ تحریر اور ذوق و افکار میں انقلاب انگیز تبدیلیاں آچکی تھیں۔ تغیرات کا یہ سلسلہ پوری سرعت کے ساتھ جاری تھا۔ سیاسی خیالات میں بھی' خاص طور پر مسائل ہند کے متعلق اس کے خیالات بہت مختلف ہوچکے تھے۔ انقلابی تحریک سے وابستگی سے اس کے قلم کو شعلہ جوالہ بنادیا تھا۔ شیخ غلام محمد اس کے نظریات سے متفق نہ ہوسکے اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ انقلابیوں کے لیے کام کررہا ہے تو وہ بالکل ہی اکھڑ گئے۔ ایک دن دوپہر اسرار آدمی رات کے وقت دفتر میں آئے اور آزاد کے متعلق پوچھا۔ یہ لوگ کلکتہ سے آئے تھے اور لاہور جارہے تھے۔ شیخ غلام محمد نے چھپ کر ان کی باتیں سن لیں۔ یہ لوگ پستول لینے کے لیے لاہور جارہے تھے۔ آزاد نے اپنے کسی واقف کار کے نام خط لکھ کر دیا جس میں اس نے لکھا تھا "یہ لوگ آرہے ہیں' انہیں چھ کتابیں دلوادو" یہ چھ کتابیں دراصل چھ پستول تھے۔

شیخ غلام محمد اس کے خیالات ہی سے متفق نہیں تھے چہ جائیکہ یہ معصیت۔ انہیں ڈر لگا کہ آج یہ دہشت گرد آئے ہیں' کل پولیس بھی آئے گی۔ وہ آزاد سے صاف لفظوں میں تو نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ان کے رویے میں سرد مہری آگئی۔ آزاد کی تحریروں کی نگرانی بھی کرنے لگے۔ اکثر مضامین کو چھاپنے سے انکار کرنے لگے۔

آزاد ایسے ماحول میں کام کرنے کا عادی نہیں تھا جس میں اس پر پابندیاں ہوں۔ وہ تو اس لیے آیا تھا کہ اسے اپنے آرگن کے طور پر استعمال کرے گا لیکن وہ اپنے مقصد میں

کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا لہٰذا اس نے یہ اخبار چھوڑ دیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جو مقاصد اب اس کے پیش نظر ہیں' وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک ایک طاقت ور اور وسیع اہتمام و انظام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پریس نہ ہو۔

امرتسر سے چل کر وہ بھوپال آ گیا جہاں اس کی بہن بیاہی گئی تھی۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اس لیے سب کو عزیز بھی تھا اور پھر وہ گھر میں ٹکتا ہی کہاں تھا۔ ہمیشہ سفر میں رہتا تھا۔ بہن کے پاس بھی ایک عرصے کے بعد آیا تھا۔ بہن کی آنکھوں میں تو روشنی آ گئی۔ اس کا بھائی اتنے دن بعد اس کے گھر آیا تھا۔ تھوڑی دیر میں دوسری بہن آرزو بیگم بھی پہنچ گئیں۔ دونوں بہنیں شادی کے بعد بھوپال میں تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے دونوں بہنوں اور ان کے شوہروں کی ملازمت کا بندوبست کر رکھا تھا۔

ریاستی ماحول میں انقلابیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دونوں بہنوں کو معلوم تھا کہ آزاد کا تعلق انقلابیوں سے ہے اس لیے خوشی کے ساتھ ساتھ ان کے چہروں پر خوف بھی نمایاں تھا۔ آبرو بیگم کے شوہر تو نواب سلطان جہاں کے سیکریٹری تھے۔ ان کی پوزیشن تو اور بھی بہت نازک تھی۔ وہ جب گھر آئے اور آزاد کو بیٹھے دیکھا تو وہ بھی خوف زدہ ہوئے لیکن مروت سے بعید تھا کہ اس وقت اپنی تشویش ظاہر کرتے۔

رات کے کھانے کے بعد جب سب لوگ باتیں کرنے کے لیے بیٹھے تو ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر بھی بات نکل آئی یا نکال لی گئی۔ اس گفتگو میں پیش پیش آبرو بیگم کے شوہر احمد ابراہیم تھے۔

"میں کیا کوئی بھی اس رائے سے اختلاف نہیں کرتا کہ آزادی اچھی چیز ہے' غلامی سے نجات حاصل کرنی چاہیے لیکن تشدد اس کا راستہ نہیں" احمد ابراہیم نے کہا۔

"طاقت کا جواب طاقت ہی سے دیا جانا چاہیے۔ ظلم کرنے والوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر ملا جائے یہ کہاں کی دانائی ہے" آزاد نے کہا۔

"یہ جنگ ہندو لڑ رہے ہیں۔ مسلمان اس میں شامل ہو کر ان کے ہاتھ کیوں مضبوط کریں۔"

"بھائی جان' یہ آپ نہیں انگریز کا فلسفہ بول رہا ہے۔ یہی تو انگریز کی چال ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہو جائیں۔"

"اور آپ انہیں ایک کر لیں گے؟"

"جس دن مسلمانوں نے اس تحریک کو اپنی تحریک سمجھ لیا' یہ ایک ہو جائیں گے اور میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اور مسلم لیگ۔ بھئی' وہ تو مسلمانوں کی جماعت ہے۔ مسلمان اس طرف جائیں۔"

"مسلم لیگ کی پالیسی انگریزوں کی طرف سے نرم ہے۔ میں تو یہ بھی چاہوں گا کہ وہ انگریزوں کی شدومد کے ساتھ مخالفت کریں۔ یہ بھی ایک طرح سے انقلابیوں کی مدد ہوگی۔"

"مسلح بغاوت سے کبھی اچھے نتائج نہیں نکلیں گے۔"

"میں نے مصر' عراق اور ترکی میں دیکھا۔ وہاں بھی انقلابی کام کر رہے ہیں۔ کیا وہ بھی غلطی پر ہیں۔"

"آپ کے سرسید ہی نے مسلمانوں کو سیاست میں آنے سے روکا تھا۔"

"انہوں نے جب یہ بات کہی تھی' اس وقت وہ یہ کہنے میں حق بہ جانب تھے مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو اپنی رائے بدل دیتے۔"

"تم تو مذہبی آدمی تھے۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا" احمد ابراہیم نے پینترا بدلا۔

"آپ کو معلوم ہے میں خانقاہی مذہب کا قائل نہیں۔ میرے اور میرے والد کے درمیان یہی تنازع ہے۔ میں مذہب اور سیاست کو الگ نہیں سمجھتا۔ ہم آزاد ہوں گے تو مذہبی آزادی بھی حاصل ہوگی۔ اس لیے مذہبی افراد کا زیادہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس تحریک میں حصہ لیں اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک دن یہاں کے علما اس ضرورت کو ضرور محسوس کریں گے۔"

یہ عام سی باتیں تھیں جو اسے ہر موقع پر سننے کو ملتی تھیں لیکن اس وقت ان باتوں نے اسے یہ احساس دلایا کہ میرے بہنوئی کو میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔ وہ اپنی ملازمت کی طرف سے ڈر رہے ہیں۔ مجھے بھی ان کی مجبوریوں کا خیال کرنا چاہیے۔ وہ آیا تو اس ارادے سے تھا کہ یہاں کچھ دن رہے گا۔ لیکن ان باتوں سے ایسا بے دل ہوا کہ صبح اٹھتے ہی جانے کی تیاری میں لگ گیا اور یہی ظاہر کیا کہ وہ صرف ایک دن کے لیے یہاں آیا تھا۔

بھوپال سے چل کر وہ سیدھا بمبئی پہنچا اور وہاں سے پونا چلا گیا۔ یہاں کی برسات بہت مشہور ہے۔ یہ دن بھی برسات کے تھے۔ نہایت عمدہ موسم تھا۔ وہ اس موسم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

وہ ابھی پونا میں تھا کہ مولانا خیرالدین کی سخت علالت کا

تار آیا۔ وہ فوراً کلکتہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ گھر پہنچا تو باپ کی حالت کو قیامت ناگفتہ بہ پایا۔ وہ ہوش وحواس میں ضرور تھے لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی قوتِ ارادی ہے جو انہیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آزاد کو یاد کررہے تھے کہ وہ پہنچ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک اس سے ہلکی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا' میرے پیچھے سے تکیہ ہٹادو۔ ضعف اتنا تھا کہ حرکت نہ کرسکتے تھے۔ جب وہ لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں تو حافظ ولی اللہ' ان کے خادم خاص نے سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اس پر تعجب ہوا لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا' ان کے لب ہل رہے ہیں۔ وہ خود پڑھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے بعد کسی قدر بلند آواز سے پڑھنا شروع کردیا۔ پھر ان کی آواز دھیمی ہوگئی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد جسم کو ایک سخت لرزہ ہوا اور جاں بحق تسلیم ہوگئے۔

○☆○

سرسید کی رہنمائی نے اسے منزل تک پہنچادیا تھا کہ اہلِ مذاہب کے تمام عقائد اس رنگ وشکل میں جو عام طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں' اسے وہم وخیال نظر آنے لگے۔ عقل اتنی حاوی ہوگئی کہ جو عقائد عقل سے بعید تھے اسے ان میں شک ہونے لگا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن اس کا ذہن یہاں تک پہنچنے کے بعد دوسری طرف نکل گیا۔ وہ یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ عقائد کے جتنے حصے کو سرسید منوانا چاہتے تھے یا جن سے وہ متفق تھے' وہ بھی وہم وخیال کیوں نہ ہوں؟ وجود باری' ذات و صفات' بقائے روح' وحی والہام' نبوت۔ کیوں نا یہ سب بھی ناقابلِ تسلیم واعتراف ہوں۔ (نعوذباللہ)

سرسید کے مسلک نے ان تمام عقائد کو اتنا باریک کردیا تھا اور عقل کا عمل دخل اتنا کردیا تھا کہ طبیعت کے لیے اسے بھی نکال باہر کرنا کچھ گراں نہیں ہوسکتا تھا مثلاً قدیم خیالات کے مطابق وحی کے بابت جو تصور تھا' وہ اتنا وزنی اور مافوق عقل تھا کہ اعتقادات کو جھٹلانے کے بعد پھر اس سے انکار کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ ایک دن اس مسئلے پر سوچنے بیٹھا تو عقل نے اسے گمراہی کے گہرے غار میں اتار دیا جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اعتقاد کی روشنی روٹھ کر کہیں دور چلی گئی تھی۔ عقل نے اسے سمجھایا کہ انبیاکرام' نوع انسانی کے سب سے زیادہ ذکی افراد ہوتے ہیں' ان کا نفس ایسے حقائق کا ادراک کرلیتا ہے جو عام انسان نہیں کرسکتے۔ یہی الہام ہے۔ اسی کو وحی کہتے ہیں۔ وحی کا تقدس جو پہلے اس کے ذہن میں تھا' نکل گیا۔ ایک شور مچا اور عقل کی آندھی نے سارے چراغ بجھادیے۔

جب اندھیرا ہو اور آنکھیں دیکھنے کے لائق نہ رہیں تو آدمی مختلف چیزوں سے ٹکراتا ہے۔ وہ بھی سوالوں کے لامتناہی سلسلے سے ٹکرانے لگا۔ جواب کے لیے کوئی صدا نہیں تھی۔ ایک گتھی سامنے آتی تھی' اسے سلجھانے لگتا تھا لیکن سلجھنے کی جگہ دس گرہیں اور پڑجاتی تھیں۔ پھر ہر گرہ کے کھولنے میں دس اور نئی گرہوں کا مقابلہ پیش آتا تھا۔

وہ اب ایک ایسی حالت میں زندگی گزار رہا تھا کہ اطمینان یکسر ہلاک ہوچکا تھا۔ وہ ایسے سوالوں میں گھر گیا تھا جن کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب یہی تھا کہ مزید غور کیا جائے۔ جتنا غور کرتا تھا' سوال مزید بڑھتے تھے۔

باپ کے مرنے کے بعد مریدوں کے نذرانے بند ہوچکے تھے۔ کوئی مدد کرنا بھی چاہتا تو وہ قبول کرنے سے انکار کردیتا۔ وہ تو یہاں تک متنفر تھا کہ جب والد کی پہلی برسی آئی اور مریدوں نے عرس کا بندوبست کرنا چاہا تو اس نے صاف کہہ دیا' جس کا جی چاہے عرس منائے۔ میں اس میں شریک نہیں ہوں گا اور اس نے یہی کیا۔ کوئی مرید قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتا تو وہ ملنے سے انکار کردیتا۔ رفتہ رفتہ یہ بھیڑ چھٹنے لگی اور اس کی وہابیت مسلم ہوگئی۔

خود اس کا حال یہ تھا کہ اس کا ذہن ایک ایسے عبوری دور سے گزر رہا تھا جس میں سوچنے کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ کسی اخبار سے وابستگی بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچ سکی۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ والد کی قیمتی اشیا فروخت کرکے گھر چلا رہا تھا لیکن ثابت قدمی سے اپنے خیالات پر قائم تھا۔

ایک سال کے سوال وجواب کی جنگ نے اس نتیجے پر پہنچادیا کہ ادائے فرض کا جذبہ دل سے نکل گیا۔ مذہبی اعمال و وظائف کی جو تربیت گھر میں ہوئی تھی' وہ کھیل معلوم ہونے لگی۔ بچپن میں نماز کے لیے اٹھنا' والد کے پیچھے نماز کی صف میں کھڑا ہونا' مسجد جانا' ختم خواجگان کی محفلیں' حلقہ اور دوسرے اشغال اسے بے حقیقت خواب نظر آنے لگے۔ نماز وہ اب بھی پڑھ رہا تھا لیکن اس لیے پڑھ رہا تھا کہ بچپن کی عادت تھی۔ اتنی آسانی سے نہیں چھوٹ سکتی تھی۔ اس معاملے میں سرسید کی تقلید بھی بے اثر تھی۔ سرسید کا خیال تھا' نماز کے اصلی اوقات تین ہی ہیں۔ تین وقت میں پانچ نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ ظہر اور عصر ملا کر پڑھی جاسکتی ہیں۔ وہ متفق تھا لیکن عمل نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی عادت نہیں تھی۔ ظہر کو ظہر کے وقت اور عصر کو عصر کے وقت ادا

کرتا رہا۔ نوافل کا حال بھی یہی تھا۔ سرسید کے اصول کے مطابق بس فرض پڑھ لینا کافی تھا لیکن وہ سنن ونوافل ادا کرتا رہا۔

وہ یقینی اور بے یقینی کے راستے پر کبھی گر کر کبھی سنبھل کر چل رہا تھا۔ خیال کچھ اور تھے' عمل کچھ اور۔ آخر وہ رات بھی آگئی جب اسے آخری فیصلہ کرنا تھا۔ ایک مبارک یقین کی جگہ ایک بے رحم انکار اس کے حصے میں آنے والا تھا۔ تمام شب کشمکش میں کٹ گئی۔ بڑا سخت مقابلہ رہا۔ اس نے ذہن کو ساری قوت خرچ کرکے تمام زنجیریں (اگر وہ زنجیریں تھیں) توڑ ڈالیں۔ صبح کے قریب وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس کے یقین نے پھر ایک آخری ہچکی لی۔ ٹھیک صبح صادق کا وقت تھا۔ نماز کے لیے اٹھنے کے بجائے جب اس نے سونے کا ارادہ کیا تو اس کی عادت نے اسے جھنجوڑا۔ خیال آیا کہ یہی وقت تھا جب میں خدا کے حضور کھڑا ہوتا تھا اور نہایت ذوق وشوق سے نماز پڑھتا تھا اور اب آنکھیں بند کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا۔ جب جذبات پُرسکون ہوئے تو ذہن نے ملامت کی' یہ وہی رسم وعادت کا ضعف ہے۔ یہ وہی زنجیر ہے جس کے ٹوٹنے پر دماغ کی اصلی آزادی حاصل ہوجائے گی۔ سورج نکل آیا اور اس نے نماز نہیں پڑھی۔

اس کے بعد نماز ترک کردی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد عید آگئی۔ اس میں شرکت ناگزیر تھی چنانچہ دوگانہ پڑھا لیکن شیطان اتنا حاوی ہوگیا تھا کہ سخت ندامت ہوئی اور فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اس سے بھی اجتناب کرے گا۔

یہ تو ہوگیا' اعمال ووظائف سے انکار۔ ابھی تو خود مذہب کی حقیقت پر سوچنا باقی تھا۔ عقل کی تعریف ہی یہ ہے کہ یہ ایک جگہ رکتی نہیں۔ ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے اور جب بھٹکنے پر آتی ہے تو صاحب عقل کو ساتھ لے کر بھٹکتی ہے۔

یہ بات اس کی طبیعت میں راسخ ہوگئی تھی کہ وہی مذہبی اعتقاد صحیح ہے جو عقل اور معلومات مادیہ کے مطابق ہے اور پورا اعتقاد تھا کہ قرآن بھی اسی کا داعی ہے۔ اس طرف تو ذہن نہیں گیا کہ یہ کسوٹی ہی سرے سے غلط ہے لیکن عقائد پر یقین کا خاتمہ ہوگیا۔

اس خالی ذہن کے ساتھ مذہب کا مطالعہ کیا تو اختلاف و نزاع کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ مذاہب خود مختلف' ہر مذہب میں پھر اختلاف۔ نزاع واختلافات کا یہ مکمل سلسلہ صداقت نہیں ہوسکتا۔ یہ اس کے ذہن کی کارستانی تھی جو اسے صداقت سے دور لے جانے کے لیے کوشاں تھی۔

ادھر سے نظر ہٹی تو خود زندگی ایک سوال کی طرح سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ خود زندگی کیا ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مذہب کی طرح یہ گتھی بھی سلجھنے میں نہیں آتی تھی۔ تھک ہار کر اسے یہی کہنا پڑا کہ سب فریب ہے۔ کوئی حقیقت نہیں' کوئی صداقت نہیں۔

جب کسی چیز کا وجود نہیں تو اس پر سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جب ذہن اس حالت پر پہنچ گیا کہ ہر چیز سے انکار کر بیٹھا تو گویا دماغ کی موت واقع ہوگئی۔ اس نے سوچنا چھوڑ دیا۔ گویا اپنی حالت پر قانع ہوگیا۔ اس کیفیت کو اس اطمینان کا نام دیا اور یہ سمجھا کہ جس سکون کی تلاش میں وہ چلا تھا' وہ سکون اسے حاصل ہوگیا۔

اب وہ پکا دہریا بن چکا تھا۔ دنیا کے لیے وہ کچھ .... بھی ہو لیکن اپنی تنہائیوں میں خدا کے وجود اور اس کے مذاہب سے انکار کر بیٹھا تھا۔ دنیا اسے روشن خیال تصور کررہی تھی لیکن وہ جہل کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ خاندانی مذہب کی تردید کرتے کرتے خود مذہب ہی کی تردید کر بیٹھا اور وہ بھی یوں ہی نہیں' بہت سوچنے سمجھنے کے بعد۔

○☆○

ہندوستان کی سیاسی فضا بدستور کشیدہ تھی۔ جلسے' جلوسوں' مظاہروں اور ہڑتالوں کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ حکومت پریشان ہوگئی۔ بنگال دہشت پسندوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پنجاب میں سردار اجیت سنگھ اور لالہ لاجپت نے سیاسی ٹکراؤ کا آغاز کیا اور دونوں جلاوطن کردیے گئے۔ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ صرف مشرقی بنگال میں چوبیس کے لگ بھگ نیشنل اسکول قائم کیے گئے۔

مسٹر بپن چندرپال نے اخبار "نیو انڈیا" نکال کر بنگال کو ایک نیا مزاج دیا تھا۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔ پنجاب' آندھرا' سی پی' بنگال اور مہاراشٹر میں نیشنل یونیورسٹیاں قائم کرنے کی مہم چلی۔ اخباروں میں انگریزوں پر کھلم کھلا تنقید شروع ہونے لگی۔ آرہندو گھوش کو گرفتار کرلیا گیا۔ بال گنگادھر تلک بھی گرفتار کرلیے گئے۔

اس تمام بیداری کا مرکز کلکتہ تھا۔ آزاد کلکتے ہی کا شہری تھا۔ اس کا بچپن یہیں جوان ہوا تھا۔ وہ ان ہنگاموں کو صرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ ان میں شریک بھی تھا۔ پس پردہ اس کے مشورے اور کوششیں کام کررہی تھیں۔ وہ اپنی

"مذہبی حالت" سے گزرنے کے بعد پوری طرح انقلابیوں کے ساتھ تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا، کئی راست باز علما کا استعمار دشمن، ذہن روشن ضرور تھا لیکن اپنے دائرے سے باہر عوامی تحریک کی خصوصیت نہیں رکھتا تھا۔ عالمِ اسلام کے مراکز خصوصاً ترکی کو نشانہ بنایا جارہا تھا۔ فرنگی استعماریت بساطِ عالم پر مسلمانوں کو کچلنے اور محکوم بنانے کے لیے نت نئی چالیں چل رہی تھی ۔ یہ چالیں ہندوستانی مسلمانوں کو طیش دلانے کے لیے بہت تھیں اور بالآخر مسلمان علما نے بھی حکومتِ وقت کو گرانے کے لیے اپنی تحریکوں کا آغاز کردیا تھا۔

آزاد اس نئے اٹھنے والے طوفان سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ان تحریکوں کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ تھا۔ اسی کے مشورے سے، مولانا محمود حسن دیوبندی نے ایک خفیہ تنظیم بنا کر اپنے تلانذہ کو ملک سے باہر بھجوایا تھا اور ملکی آزادی کے لیے پورا نقشہ مرتب کیا تھا لیکن یہ تحریک اپنوں کی غداری سے ناکام ہوگئی۔

اس کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے عوامی تحریک نہیں بنایا گیا تھا۔ مولانا محمود حسن نے اپنے شاگردوں کو ملک سے باہر بھیجا۔ خود بھی جان جوکھم میں ڈال کر چلے گئے۔ اس کی ہوا بڑے بڑے مشائخ کو بھی نہیں مل سکی تھی اور یوں یہ تحریک وقت سے پہلے دم توڑ گئی۔

آزاد یہ چاہتا تھا کہ ان تحریکوں کو اجتماعی فکر دے کر نہ صرف ایک عمومی تحریک کی بنا ڈالی جائے بلکہ عوام میں قومی جدوجہد کا ذوق پیدا کیا جائے۔

۱۹۱۱ء میں جب تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان ہوا تو ہندوؤں کے مقاصد پورے ہوگئے اور انقلابی تحریکیں سرد پڑنے لگیں لیکن مسلمانوں میں ایک نیا غم و غصہ پیدا ہوگیا۔ یہی وقت تھا جب مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی ضرورت تھی۔ انہیں حکومتِ وقت کے خلاف بھڑکانے کے ذرائع تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں میں خفیہ طور پر کام کرنے والی تحریکوں کے لیے ایندھن مہیا کرنے کی ضرورت تھی۔

حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ جنگِ بلقان چھڑ گئی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ مولانا شوکت علی نے "انجمن خدام کعبہ" کی بنیاد رکھی۔ مولانا محمد علی جوہر "کامریڈ" کو کلکتہ سے دہلی لے آئے۔ علی گڑھ کالج کے طلبہ نے ایک وقت کا کھانا چھوڑ کر، باقی رقم بلقان بھیجنی شروع کردی۔

آزاد دیکھ رہا تھا کہ ہندو صحافی قلم کی جوت جگا کر ملک میں ایک نئی روح پھونک رہے ہیں لیکن اس کے اثرات ہندو عوام کے لیے ہیں اور مسلمان جمود کا شکار ہیں۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی اخبار کی ضرورت ہے۔

○☆○

باپ کی زندگی میں آزاد کے ذہن میں جن شکوک نے جگہ بنائی تھی، باپ کی موت کے بعد ان شکوک کی تکمیل دہریت کی شکل میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک وہ انہی اندھیروں میں سفر کررہا تھا۔ گمراہی کا کون سا کانٹا تھا جو اس کے دل میں چبھ نہیں چکا تھا۔ شک کا وہ کون سا زخم تھا جس کا ذائقہ اس نے چکھا نہیں تھا۔ وہ کون سی ٹھوکر تھی جو اس نے کھائی نہیں تھی۔

دوسری طرف عالم یہ تھا کہ ذخیرۂ کتب بہ کمال و تمام دیکھ چکا تھا اور ساتھ ساتھ زبان و علم کی جدید کروٹوں سے آگاہ ہورہا تھا۔ اس نے ہندوستان کا سارا لٹریچر پڑھ لیا تھا۔ عربی، فارسی، اور اردو میں مذہب، تاریخ، فلسفہ، شاعری، منطق، طب، غرض کہ ہر فن پر جتنی کتابیں تھیں، اس کے مطالعے میں آچکی تھیں۔ وہ خود ایک چلتا پھرتا کتب خانہ بن گیا تھا۔

اس کی کثرتِ مطالعہ ہی نے اسے بھٹکایا تھا اور اسی نے اسے راہِ راست پر لانے میں مدد دی۔ اگر اس کی پہلی حالت قابلِ حیرت تھی تو دوسری حالت بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ اس قسم کی منزلیں کئی دہائیوں میں بھی طے نہیں ہوئیں لیکن اس نے چودہ سال کی عمر میں شروع ہونے والے اندھیروں کو بائیس سال کی عمر تک پہنچ کر روشنی میں بدل دیا۔

اسے جو کچھ مطلوب تھا وہ خود اپنی طلب و جستجو سے ڈھونڈ نکالا۔ عرصے تک دہریت کے جلوۂ سراب کو آبِ حیات سمجھتا رہا اس راہ کی جتنی بیماریاں ہیں، وہ اسے لگیں اور جتنے نسخے تھے وہ بھی اس نے استعمال کیے۔

اور آخر کار سب سے بڑی بنیادی سچائی اس پر کھل گئی۔ مذہب کی راہ عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات سے طے کی جاسکتی ہے۔ مذہب اور عقل کے میدان بالکل الگ الگ ہیں اور دونوں کی ایسی پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو باہم مخالف سمجھ کر توڑنے یا جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ محسوسات کی راہ ہم ادراک سے طے کرسکتے ہیں مگر مذہب جس عالم کا پیغام لاتا ہے اس کے لیے ہمارے پاس صرف جذبہ ہے اور یہ بڑی بھول ہے کہ چاندی، سونا تولنے کے کانٹے سے ہوا اور روشنی کا بھی وزن معلوم

کرنے کی کوشش کریں۔

گویا وہ ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد اس منزل پر آگیا کہ قرآن ایک عالم گیر مشترک سچائی ہے اور اس سچائی کا دوسرا نام اسلام ہے۔ اسلام ہی توحیدِ ربانی کی آخری آواز ہے۔

خود اس کا کہنا تھا۔

"لوگ قرآن کے مطالعے سے سیرت کی طرف آتے ہیں۔ میں سیرت کے مطالعے سے قرآن کی طرف لوٹا تو میرے دل و دماغ کا ہر کانٹا صاف ہوگیا اور میں بفضلِ تعالیٰ انکار و الحاد کے بیابان سے نکل آیا۔"

اس نے اس عالم گیر صداقت کی روشنی سے فیض یاب ہونے کے بعد اپنے اردگرد نظر ڈالی، عجیب منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ مسلمان داخلی اعتبار سے پراگندا ہو چکے ہیں۔ عیسائی سلطنتیں عالمی طاقت کی حیثیت سے مسلمانوں کی بیخ کنی کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کے یورپی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ ہندوستان میں آزادی کا تصور پیدا ہو رہا ہے لیکن مسلمان اس تصور خالی الذہن ہو چکے ہیں۔

دہریت سے دوبارہ اسلام کی طرف آتے ہوئے اس میں نو مسلموں کا سا جوش پیدا ہوگیا تھا۔ وہ کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا کہ اس کا ملک جلد سے جلد برطانوی تسلط سے آزادی حاصل کرلے اور اس کے ساتھ ہی دین کی محافظت اس کا فریضۂ خاص تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے ایک ایسے اخبار کے اجرا کے حق میں تھا جس کا مزاج دینی ہو، جس کی زبان مسلمانوں کے دینی و تہذیبی مزاج کی آئینہ دار ہو، جس میں حکومتِ وقت کے لیے للکار ہو، جو نوجوانوں کے لیے زمزمۂ بیدار ہو، جو نئی لیڈرشپ پیدا کرے، جو شب کے اندھیرے میں دن کا اجالا ہویدا کرے۔

ایک ذاتی اخبار کا خواب اس نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ عراق، مصر اور ترکی کے دورے پر گیا تھا اور ینگ ٹرکس تحریک کے رہنماؤں سے ملا تھا اور ان کا ہفتہ وار اخبار دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ دل اور ذہن کی جنگ میں مبتلا تھا۔ پھر یہ وقفہ بڑھتا چلا گیا۔ اب اس کے خیالات مجتمع ہوئے تو اخبار کا خیال آیا۔

عرب ماحول کے پروردہ ابوالکلام آزاد نے اپنے شعور کی ابتدائی منزلیں مصر میں طے کیں اور قیامِ مصر نے اس پر بے پناہ اثر چھوڑا۔ مصری صحافت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مصری ٹائپ میں چھپنے والے مصور پرچے عام تھے۔ انہی میں جرجی زیدان کا "الہلال" بھی تھا۔ پھر ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے بعد ترکی اخبار بھی مصری نمونے پر چلنے لگے تھے۔ لبنان میں بیروت سے نکلنے والے چند پرچے اسی انداز میں شائع ہوتے تھے۔

اس نے اپنے اخبار کا اجرا کرنا چاہا تو پورے پس منظر پر اس کی نظر تھی لہٰذا اس نے اپنے ہفتہ وار اخبار کے لیے، جرجی زیدان کے اخبار کے نام پر "الہلال" رکھا۔ اس کی ترتیب و تہذیب بھی بالکل اسی انداز سے کی۔ اس لیے "الہلال" بالکل نئی چیز معلوم ہوا اور اپنے انوکھے پن کے سبب بہت جلد ممتاز حیثیت اختیار کرگیا۔ آزاد کے فضل و کمال کا تنوع، مطالعے کی وسعت، پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور سب سے بڑھ کر اس کا منفرد اندازِ تحریر اس اخبار کی اضافی خوبی تھی جس کا جواب کسی دوسرے اخبار کے پاس نہیں تھا۔

اسی وقت ہندوستان میں دو قابلِ ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک "زمیندار" اور دوسرا "مسلم گزٹ" اولذکر کی توجہ ترکی پر مرکوز تھی جبکہ دوسرا علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا۔ اس کی پالیسی نہ برہمی تھی نہ جارحانہ، نہ حریفانہ بلکہ روٹھے ہوئے دوست کا رویہ تھا۔ یہ ماحول تھا جس میں آزاد نے "الہلال" جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ذہنوں سے محو ہوگیا اور لوگ سوچنے لگے، کیا یہ آواز اسی دنیا کے کسی انسان کی ہے؟ کیا یہ زبان انہی انسانوں میں سے کسی فرد کی زبان ہے؟

یہ وہ وقت تھا کہ جب دو سروں کا تو ذکر کیا، ذکر، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلے قرارداد قیصرِ ہند ملکِ معظم سے ملک و قوم کی وفاداری کی منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی، جنوبی افریقہ سے ہندوستان نہیں پہنچے تھے اور پوری سیاسی تحریک بہت نرم قدموں سے چل رہی تھی۔

الہلال پہلا اخبار تھا جو حکومت پر کڑی نکتہ چینی کر رہا تھا۔ انگریز حکومت کے عائد کردہ سنسر کے باوجود اپنے قارئین کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی دعوت دے رہا تھا۔ ہندوستان کے تمام مجاہدین کو ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونے پر راغب کر رہا تھا۔ مدیر الہلال کا قلم اس راہ میں کسی خوف کی پروا کرنے سے قاصر تھا۔

ایک اور بات جو انگریزوں کو کھٹک سکتی تھی، وہ یہ تھی کہ یہ خالص اسلامی اخبار تھا۔ اس اخبار میں مسلمانوں کے مسائل پیشِ نظر رہتے تھے۔ قرآن کی دلنشین تفسیر الہلال کا طرۂ امتیاز تھا۔ یونیورسٹی کی بحث ہو یا جنگ کی خبریں، قرآنی آیات ہر جگہ موجود نظر آتی تھیں۔ گویا الہلال کا مدیر

نوجوانوں کو قرآن سے قریب تر کر رہا تھا۔ مسلمان جنہیں انگریز اپنا وفادار کہتا تھا' انہیں بھڑکانے کی جسارت کر رہا تھا۔

الہلال کی ایک خوبی اس کے ایڈیٹر کی بالکل نئی زبان تھی۔ عربی خطبوں کا پُرجوش انداز' پہاڑوں کا شکوہ' طوفانوں کا شور' کو ہستانی چشموں کی روانی اس زبان کی خصوصیت تھی۔ اس انوکھی زبان میں انوکھے خیالات کے بیان نے پڑھنے والوں کو چونکا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے الہلال کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔

یہ کہنے کو اخبار تھا لیکن ایک تحریک کا روپ دھار گیا۔ کتنے ہی دلوں میں چنگاری بن کر اتر گیا۔ اسے پڑھ کر نئی لیڈرشپ پیدا ہونے لگی۔ اس کی اسی مقبولیت اور اثر پذیری سے حکمراں خائف ہوگئے۔ ہراساں کرنے کے لیے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کرلی گئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ آزاد اس سے ڈر کر اپنی پالیسی تبدیل کرلے گا لیکن اس نے ضمانت جمع کردی۔ پالیسی پھر بھی وہی رہی۔ حکومت نے کچھ دن بعد دس ہزار روپے کی ضمانت مزید طلب کرلی۔ بہت جلد یہ ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ آزاد ان ہتھکنڈوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ وہ مالی نقصان برداشت کرتا رہا لیکن اپنی پالیسی میں تبدیلی نہ آنے دی۔ بنگالی وبہار کے تمام انقلابی اس کے ساتھ تھے۔

جب ریاستی ہتھکنڈے اسے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو حکومت نے الہلال پریس ہی ضبط کرلیا۔ یہ اتنا بڑا دھچکا تھا کہ وہ گم صم ہوکر رہ گیا۔ اتنے شوق سے نکالا ہوا پرچہ یوں اچانک بند ہوجانے سے اس کا مایوس ہوجانا فطری تھا لیکن وہ تو اس راہِ پُرخار میں آیا ہی اس نیت سے تھا کہ زخموں کو پھول کہے گا۔ وہ کمزور حکومت کے بزدلانہ رویے پر مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

ابھی اس اخبار کو بند ہوئے پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے "البلاغ" پریس قائم کیا اور اس نام سے اخبار شائع کرکے پھر صحافت کی دنیا میں آگیا۔ یہ ایک اور جرأت مندانہ قدم تھا۔

البلاغ بڑے کروفر سے نکلا (۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء) الہلال کی طرح اس کا نصب العین بھی مسلمانوں میں آزادی کا شعور پیدا کرنا اور انہیں ہر قربانی کے لیے تیار کرنا تھا۔

الہلال کی ترتیب وتدوین' لب ولہجہ اور مضامین یہ ظاہر کیا کرتے تھے کہ ان کی روح میں کلام الٰہی رچا ہوا ہے۔ جب البلاغ شائع ہوا تو پہلے شمارے میں اشتہار شائع ہوا۔ اس اشتہار سے ظاہر ہوتا تھا کہ تفسیرِ قرآن (ترجمان القرآن) اس کے قلم سے نکل چکی ہے اور اب طباعت کے مرحلے میں ہے۔

اس کے جادو اثر قلم سے قرآن کی تفسیر اور ترجمے کا اعلان ایک خوش آئند خبر تھی اور مسلمانوں میں نیا جوش واثر پیدا کرنے کا سبب تھی۔ اب وہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد تھا۔

حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ واسطہ ایسے سرپھرے سے پڑا ہے کہ ایک کے بعد ایک اخبار جاری کرتا رہے گا' نہ قلم بدلے گا نہ قلم سے نکلنے والے الفاظ کے چہرے مہرے تبدیل ہوں گے۔

البلاغ سے بھی حکومت کو وہی شکایت تھی جو الہلال سے رہ چکی تھی لیکن اس مرتبہ حکومت کی نظرِ عنایت اخبار پر نہیں خود اس پر ہوئی۔ اوائل مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے اسے صوبہ بدر کرنے کے احکامات جاری کردیے۔ اب اسے کلکتہ چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا۔ کہاں؟ دہلی' پنجاب' یوپی اور مدراس کی حکومتیں پہلے ہی اپنے صوبوں کے دروازے اس پر بند کرچکی تھیں۔ اب وہ بمبئی کو مسکن بنا سکتا تھا یا بہار میں قیام کرسکتا تھا۔ رانچی (بہار) چونکہ کلکتہ سے قریب تھا اس لیے اس نے رانچی کو ترجیح دی اور موراباری گاؤں میں قیام کیا۔ اس علاقے میں کول' اڑاؤں اور منڈا جیسے غیر مہذب قبیلے رہتے تھے یا چند بنگالیوں نے کچھ بنگلے بنوائے تھے۔ ایسا ہی ایک بنگلا ایک بنگالی مسلمان نے اسے رہنے کے لیے دے دیا۔

وہ تو جہاں بیٹھتا تھا' باتوں کی بھیڑ' سننے والوں کا مجمع لگا لیتا تھا۔ جمعے کا دن تھا' وہ شہر کی ایک مسجد میں نماز ادا کرنے گیا۔ کچھ لوگوں نے اسے پہچان لیا اور اصرار کیا کہ خطبہ دیں اور امامت کریں۔ رانچی کے چھوٹے سے شہر کے لوگوں نے ایسا خطبہ' ایسا خطاب اس سے پہلے کب سنا ہوگا۔ اس کی بلاغت کی دھوم مچ گئی۔ رانچی میں عیسائی مشنریوں کا زور تھا لہٰذا وہاں کے مسلمانوں نے آزاد کی آمد کو اشارۂ غیبی سمجھا۔ اب ہر جمعے کو رانچی کی جامع مسجد اس کے خطاب سے گونجنے لگی۔ لوگ پروانوں کی طرح جمع ہونے لگے۔

حکومت نے اسے اس لیے صوبہ بدر کیا تھا کہ عوام سے اس کا رابطہ ٹوٹ جائے لیکن اس مقبولیت نے اسے چوکنا کردیا۔ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو یکایک حکومتِ ہند نے اس کی نظربندی کے احکام جاری کردیے۔ ان احکامات کے ساتھ ہی رانچی میں اس کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ جس قدر کاغذات ملے' یہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے۔ انہی کاغذات میں ترجمہ و

تفسیر کا مسودہ بھی تھا۔ یہ کاغذات حکومت کے کسی مطلب کے نہیں تھے اس لیے دو ہفتے بعد واپس کردیے گئے۔ اس نے شکر بھیجا اور نظربندی سے ملنے والی فرصت سے فائدہ اٹھاکر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگیا۔ ارادہ یہی تھا کہ اس خلوت نشینی میں وہ تفسیر مکمل کرلے گا۔

ابھی اس صورتِ حال پر تین مہینے بھی بسر نہیں ہوئے تھے کہ ایک مرتبہ پھر تفتیشی افسران آگئے۔ وہ اس وقت بھی کسی تحریر کی تکمیل میں مشغول تھا۔ ایک افسر نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔

"کسے خط لکھ رہے ہو؟"

"ان کو لکھ رہا ہوں جنہیں پڑھنا نہیں آتا اور بار بار تلاشی لینے آجاتے ہیں۔"

"اس مرتبہ پڑھے لکھوں کو بھیجا گیا ہے" افسر نے کہا اور اس کے ساتھیوں نے کاغذات اور مسودے سمیٹنے شروع کردیے۔

"یہ کاغذات حکومت کے کسی کام کے نہیں ہیں۔ پہلے بھی آپ لوگ انہیں لے گئے تھے اور پھر واپس کردیے گئے۔"

"اس مرتبہ یہ سب کاغذات معائنے کے لیے حکومتِ ہند کو بھیجے جائیں گے۔ مقامی حکومت نے ان کا اچھی طرح معائنہ نہیں کیا تھا۔"

"حکومتِ ہند بھی مایوس ہوگی کیونکہ یہ تحریریں سیاسی نہیں، میری کتابوں کے مسودے ہیں۔"

"ہمیں معلوم ہے تم کتابوں میں کیا لکھتے ہو۔"

ان لوگوں نے ایک نہ سنی اور تمام کاغذات حتیٰ کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ان میں نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا مسودہ بلکہ بعض دوسری تصنیفات کے بھی مکمل و نامکمل مسودات تھے۔

گھر میں جھاڑو سی پھر گئی تھی۔ وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔ سب سے زیادہ فکر اسے تفسیر القرآن کی تھی۔ ترجمے کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورہ النساء تک پہنچ چکا تھا مگر اب اس کے قبضے میں کچھ نہیں تھا۔

اس نے نویں پارے سے ترجمے کا آغاز کردیا کہ جب کاغذات واپس مل جائیں گے، تو یہ ترتیب پوری ہوجائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کاغذات کی واپسی کے لیے کوششیں کرتا رہا لیکن ایک طویل خط و کتابت کے بعد جواب یہ ملا کہ سردست واپس نہیں مل سکتے اور یہ بھی نہیں بتایا جاسکتا کہ کب واپس ملیں گے۔

کاغذات کی واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مجبور ہوکر اس نے یہی سوچا کہ گم شدہ کاغذات کا از سرِ نو ترجمہ کرکے کتابت مکمل کرلی جائے۔ چند ماہ کی محنت کے بعد یہ کام مکمل ہوگیا۔ کام یہاں تک پہنچا تھا کہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے اس کی نظربندی ختم کردی۔ اب وہ آزاد تھا کہ اس کی طباعت کرا سکے۔ راہ کی تمام رکاوٹیں دور ہوگئی تھیں۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

آزاد جب کلکتہ پہنچے تو ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوچکی تھی۔ تحریکِ خلافت کا آغاز ہوچکا تھا۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپس آچکے تھے۔ کانگریس کے جلسوں نے پورے ملک میں نئی سیاسی زندگی کے آثار پیدا کردیے تھے۔ جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ علما کے حلقے میں سیاسی شعور بیدار ہورہا تھا۔ "الہلال" اور "البلاغ" کی سیاسی دعوت اب اپنے نتائج ظاہر کررہی تھی۔ صدائے بازگشت ہر گوشے سے بلند ہونے لگی تھی۔

انہوں نے کلکتہ میں چند روز قیام کیا اور اس کے بعد دہلی کا رخ کیا جہاں امرتسر کے جلسوں میں شرکت کے بعد مختلف رہنما ایک متحدہ مقصد کے لیے جمع ہورہے تھے۔ حکیم اجمل خاں کے دولت کدے پر ان کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔ یہی وہ ملاقات تھی جہاں گاندھی نے اس جوہر کو پہچانا اور آزاد، صحافت سے سیاست میں داخل ہوئے۔

اس وقت رہنمایانِ قوم کے سامنے یہ تجویز زیرِ غور تھی کہ خلافت اور ترکی کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات اور جذبات سے برطانوی حکومت کو آگاہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وائسرائے کے پاس ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد کو اس فیصلے سے اختلاف تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی جیسی شخصیت سے اسے بات کرنے کا موقع مل رہا تھا "یہ معاملہ عرض داشتوں اور ملاقاتوں کی حد سے گزر چکا ہے۔" آزاد نے اپنی رائے پیش کی۔

"پھر آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟" گاندھی جی نے پوچھا۔

"اس وقت ملک میں سیاسی تحریک کے سرگرمِ عمل ہونے کی راہ ہموار ہوچکی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

گاندھی نے ان کی طرف چونک کر دیکھا "آپ کس فائدے کی بات کر رہے ہیں؟"

"حکومت سے ہر قسم کے تعلقات توڑ لیے جائیں۔ یہ وقت سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کا نہیں ہے۔"

"آپ پر ابھی تک انقلابی تحریک کے اثرات ہیں۔"

"ضروری تو نہیں کہ اس تحریک میں تشدد کی راہ اختیار کی جائے۔ ٹالسٹائی نے اٹلی کے باشندوں کو مشورہ دیا تھا کہ اگر کسی جابر حکومت کو وہ بے بس کرنا چاہتے ہیں تو عدم تعاون کی پالیسی اپنائیں۔ ٹیکس دینے سے انکار کیا جائے' ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیا جائے۔ ان تمام اداروں سے تعلق ختم کر لیا جائے جن سے حکومت کا نظام چل رہا ہو۔"

"آپ کی تاریخی معلومات بہت وسیع ہیں لیکن سیاسی بصیرت کا اس وقت یہ تقاضا نہیں۔"

گاندھی ان کی رائے سے متفق نہیں تھے البتہ ان کے اختلاف کے بعد انہیں وفد میں شامل نہیں کیا گیا۔ آزاد کی شمولیت کے بغیر ایک وفد تشکیل دیا گیا جس نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ وائسرائے نے کسی قسم کی کوئی کارروائی کرنے سے معذرت چاہی اور وفد کو مشورہ دیا کہ وہ انگلستان جائیں۔ یہ وفد وائسرائے کے مشورے سے انگلستان گیا اور توقع کے عین مطابق واپس آگیا۔

اس منزل پر گاندھی کو مولانا آزاد کی رائے کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اب گاندھی نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ سیاسی تحریک کا آغاز کیا جائے چنانچہ ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسے میں گاندھی نے حکومت سے ہر طرح کے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔

کلکتہ کے خصوصی اجلاس میں عدم تعاون کی جو تجویز سامنے آئی تھی اس پر عمل درآمد کا سلسلہ زور شور سے شروع ہو گیا تھا۔ سرکاری خطابات اور تمغے واپس کیے جا رہے تھے۔ فوج اور پولیس کی ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کی جا رہی تھی۔ حکومت کے خلاف آئے دن کے مظاہروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ تحریک کے دفتروں کے سامنے رضاکاروں کی بھرتی کے لیے لوگوں کی طویل قطاریں لگنے لگیں۔

آزاد' سول نافرمانی کی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ ان کی شعلہ بیانی جلسوں میں آگ لگا رہی تھی۔ ان کی مصروفیت کا احوال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بنگال سے لے کر پنجاب' سندھ اور سرحد کے سیکڑوں شہروں میں گئے' ہزاروں جلسوں سے خطاب کیا۔ صدارتیں کیں۔

تمام سرکردہ رہنما گرفتار ہو چکے تھے۔ حکومت کی مصلحتیں مولانا آزاد کو گرفتار کرنے میں مانع تھیں۔ وہ اپنی سرگرمیاں اسی رفتار سے جاری رکھے ہوئے تھے بلکہ اب تمام ذمے داری انہی پر آن پڑی تھی اس لیے وہ اور بھی زیادہ سرگرم تھے۔ پورے ملک کے طوفانی دوروں پر نکلے ہوئے تھے۔

پرنس آف ویلز کی آمد آمد تھی۔ حکومت نے شہزادے کے استقبال کے لیے نہایت شاندار انتظامات کیے تھے۔ کانگریس اور تحریکِ خلافت نے عدم تعاون کے پروگرام کے تحت بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ حکومت بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی۔

شہزادے نے مختلف شہروں کا دورہ شروع کیا تو ہر جگہ سرد مہری نے اس کا استقبال کیا۔ کسی بھی شہر میں کسی قابلِ ذکر فرد نے اس کا استقبال نہیں کیا۔ کلکتہ' شہزادے کے دورے کا آخری مقام تھا جہاں اسے وکٹوریہ میموریل ہال میں خطاب کرنا تھا۔

مولانا آزاد ان دنوں بالی گنج کی ایک کوٹھی میں کرائے پر رہ رہے تھے۔ دوپہر کے قریب پولیس نے سڑکوں کی ناکا بندی کر دی۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ انتظامات کس لیے ہو رہے ہیں۔ بات اس وقت سمجھ میں آئی جب پولیس نے مولانا کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ مولانا اس وقت اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے ڈپٹی کمشنر' اسپیشل برانچ کو اوپر بلوا لیا۔

"ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا" ڈپٹی کمشنر نے کہا۔

"آپ کے پاس میری گرفتاری کا وارنٹ ہے؟"

"جی نہیں۔"

"قانونی تقاضے تو پورے کر لیتے۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ بہرحال میں تیار ہوں۔"

"اس قدر جلدی نہ کیجئے۔ اپنا سامان ساتھ لے لیجئے۔"

مولانا نے اس کے مشورے کا استقبال اپنی ایک مسکراہٹ سے کیا اور صرف ایک چادر لے کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے وقت خیال آیا' اہلیہ سے تو مل لوں۔

"یہ آگئے ہیں۔ ان کے ساتھ جانا تو پڑے گا۔"

"خدا حافظ" ان کی اہلیہ صرف اتنا کہہ سکیں۔ باقی باتیں ان کے صبر و تحمل نے کیں۔

مولانا اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہتے تھے اس لیے یہ فکر نہیں تھی کہ ان کے بعد کیا ہوگا بلکہ یہ.....

..... انتظام انہوں نے کیا ہی کسی ایسے وقت کے لیے تھا۔ وہ یا تو سفر میں رہتے تھے یا گرفتاری کے انتظار میں اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی سسرال کو اپنے ساتھ رکھیں۔

مولانا پولیس کمشنر کے دفتر پہنچے اور اس کے بعد انہیں علی پور سینٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔ اس جیل کی دو منزلہ عمارت کے اوپر نیچے پانچ پانچ کمرے تھے۔ ہر کمرے کی لمبائی دس فٹ اور چوڑائی ۹ فٹ تھی۔ جس کمرے میں مولانا تھے' اس میں ایک صراحی' ایک تام چینی کا کٹورا' ایک اسٹول اور ٹیبل تھی۔ سونے کے لیے ٹاٹ کا بستر اور دو کالے کمبل تھے۔

پیری مریدی' نذر نذرانے' عیش و عشرت کو چھوڑ کر انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا' یہ اس راستے کا پہلا پڑاؤ تھا لیکن وہ خوش تھا کہ اس کی جدوجہد ملک و ملت کے کام تو آ رہی ہے۔

قانون کے مطابق گرفتاری کے چوبیس گھنٹے بعد انہیں عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا مگر حکومت بوکھلائی ہوئی تھی۔ گرفتاری کے چار دن بعد انہیں عدالت کے روبرو پیش کیا گیا اور عدالت بھی کیسی' جیل کے احاطے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر مجسٹریٹ کو بٹھا دیا گیا۔ مولانا آزاد ایک اسٹول پر بیٹھے تھے۔ مجسٹریٹ نے بے دلی سے مولانا کو ان کی گرفتاری کی وجہ بتائی اور آئندہ پیشی کا حکم سنا دیا۔ عدالت برخاست۔

اگلی پیشی پر بھی کھل کر گرفتاری کی وجہ نہیں بتائی گئی اور نہ فردِ جرم عائد کی گئی۔ بس یہ کہہ کر کارروائی ختم کر دی گئی کہ انہیں ۵ جنوری کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

پانچ جنوری کا دن جیل کی کال کوٹھری میں گزر گیا۔ اگلے دن انہیں بتایا گیا کہ وہ اپنی تیاری مکمل کر لیں' انہیں آج عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا کو پولیس کی بند گاڑی میں بٹھا کر ایک فوجی کپتان کی نگرانی میں پریسیڈنسی کورٹ پہنچا دیا گیا۔

شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ زبردست مظاہروں کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ مزدور' ہوٹلوں' کارخانوں کے ورکرز اور انگریزوں کے نجی گھروں کے ملازمین عدالت کے سامنے جمع تھے۔ بسیں اور ٹرامیں رات ہی سے بند ہو گئی تھیں۔

مولانا کی وین جیسے ہی احاطۂ عدالت میں داخل ہوئی' لوگ ان کے حق میں اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گاڑی کے سامنے آ گئے۔ پولیس کی بھاری جمعیت موجود تھی لیکن لاکھوں کا مجمع سامنے تھا۔ پولیس وین ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔

"آپ وین کا دروازہ کھول دیں۔ میں لوگوں سے پُرسکون رہنے کی اپیل کرتا ہوں۔" مولانا نے اپنے محافظوں سے کہا۔

"مظاہرین بہت مشتعل ہیں۔ آپ کا کہنا نہیں مانیں گے" مولانا کے فوجی نگراں نے کہا "یہ لوگ طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ میں ابھی لاٹھی چارج کا حکم دیتا ہوں' آپ اطمینان سے تشریف رکھیں۔"

مولانا تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے "خبردار! جو آپ نے ایسی نادانی کی' دروازہ کھلوائیے۔"

فوجی کپتان ڈر گیا اور اس نے پولیس لاری کا دروازہ کھلوا دیا۔ مولانا نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ بپھری ہوئی موجیں پُرسکون ہو گئیں پھر جیسے سب کو ہوش آ گیا ہو۔ "ابوالکلام آزاد' زندہ باد۔"

کچھ دیر نعرے گونجتے رہے۔ آزاد نے اپنے ہاتھ پھر بلند کیے اور منہ سے کچھ کہے بغیر صرف اشارے سے پُرامن رہنے کی ہدایت کی۔ لاکھوں کا مشتعل ہجوم اس طرح پُرسکون ہو گیا جیسے اسے کبھی اشتعال آیا ہی نہ ہو۔ ہجوم ایک منظم استقبالیے میں بدل گیا۔ مولانا کے نگراں نے حیرت سے ان کی مقبولیت کو دیکھا اور ان کی گاڑی کو راستہ مل گیا۔ مولانا نے گاڑی سے نیچے قدم رکھا۔ ایک مرتبہ پھر نعروں کا شور بلند ہوا۔

عدالت کا کمرا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مولانا نے جونہی کٹہرے میں قدم رکھا' تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ سرکاری وکیل نے الزامات پڑھ کر سنائے۔

سماعت شروع ہوئی۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے کئی مواقع پر حکومتِ برطانیہ کو ظالم اور جابر کہا۔ اس کے علاوہ اپنی قوم کو اس کے خلاف بائیکاٹ پر اکسایا ہے۔ ایسا کرنا اور کہنا میرے اعتقاد میں شامل ہے اور میرا دینی فریضہ بھی ہے۔ میں اپنے فرض کی تعمیل سے باز نہیں رہ سکتا۔ یقیناً میں نے برملا کہا ہے کہ موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے۔ اگر میں یہ نہ کہوں تو پھر کیا کہوں؟ میرے فرض کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو حکومت ناانصافی سے باز آ جائے یا پھر وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ تیسری کوئی بات نہیں ہو سکتی۔"

سماعت ہوتی رہی اور پھر ۲۴ جنوری ۲۳ء کو مولانا نے طویل تحریری بیان عدالت میں داخل کیا۔ یہ بیان نہ صرف جرأت اور ولولے کا سرچشمہ تھا' پُرجوش خطابت کا مرقع تھا' معلومات کا خزانہ تھا' ایک مسلمان کی قوتِ ایمانی کا مظاہرہ تھا

بلکہ ادبی شاہ کار بھی تھا۔ یہ بیان بعد میں قولِ فیصل کے نام سے مشہور ہوا اور برسوں تک عدالتوں میں گونجتا رہا۔ بڑے بڑے سیاسی معرکے ہوتے رہے ہوں گے لیکن ایسا عظیم اور خوبصورت بیان کبھی کسی نے داخل نہیں کیا ہوگا۔

جیسے جیسے مقدمے کے فیصلے کا دن قریب آرہا تھا' عوام کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ مولانا کو اس ردِعمل کا احساس تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی خاطر ایجی ٹیشن ہو اور عوام کا خون بہے۔

۹ فروری کو فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ مولانا نے ۷ فروری کو جیل سے اخبارات میں بیان شائع کرایا۔

"کوئی شخص عدالت کی کارروائی دیکھنے نہ آئے۔ نہ ہی سڑکوں پر کسی طرح کا ہجوم ہو۔ سزا کا حکم ضرور سنایا جائے گا مگر لوگوں کو صبر وسکون کا دامن اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میرے ساتھ اظہارِ عقیدت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ رضاکار بن کر جیل جانے کے لیے تیار رہیں۔ ہڑتال اور مظاہرے نہ صرف اصول کے خلاف ہیں بلکہ عدم تعاون کے مقصد کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔"

مظاہروں کی بھرپور تیاریاں کرلی گئی تھیں لیکن اس بیان کے شائع ہوتے ہی شعلوں کا منہ شبنم نے دُھلادیا۔ عدالت اور جیل کے باہر کسی قسم کا ہجوم اکٹھا نہیں ہوا۔

جج نے فیصلہ سنایا۔

"ملزم نے یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو مرزا پور میں مسئلہ خلافت' پنجاب اور آزادیِ وطن کے مضامین پر نیز ۱۵ جولائی کو اسی مقام پر مسئلہ ترکِ موالات پر اردو زبان میں تقریر کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جن کے ذریعے حکومتِ وقت کے خلاف لوگوں میں نفرت اور حقارت پھیلتی تھی۔ ملزم نے خلافت کے تین سرگرم مبلغین کی سزا کے خلاف تقریر کرتے ہوئے حکومت کی شان میں نازیبا کلمات کہے اور لوگوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لیں اور جیل جانے کو تحریک کا ایک اہم مقصد خیال کریں۔ میں ملزم کو حسبِ دعویٰ استغاثہ مجرم پاتا ہوں اور زیرِ دفعہ ۱۲۴ الف تعزیراتِ ہند ایک سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔"

آزاد نے نہایت اطمینان سے فیصلہ سنا اور مسکراتے ہوئے جج سے مخاطب ہوئے "باخدا! یہ سزا تو اس سے بہت کم ہے جس کی مجھے توقع تھی۔"

○☆○

بالی گنج کی ایک کوٹھی میں اس وقت کئی آنکھیں ایک ساتھ چھلک اٹھی تھیں جب زلیخا بیگم محض ایک چادر بچھا کر زمین پر لیٹ گئیں "مولانا اس وقت جیل میں ہوں گے۔ زمین پر سو رہے ہوں گے' میں پلنگ پر کیسے لیٹ جاؤں؟"

"انہیں تو ایک سال کی سزا ہوئی ہے' میری بچی! تو کب تک زمین پر سوتی رہے گی؟" زلیخا کے والد نے کہا۔

"ایک سال ہوتا ہی کتنا ہے۔ کیا میں مولانا کی خاطر اتنی سی تکلیف نہیں اٹھا سکتی۔"

"ٹھیک ہے' ہم سب بھی آج سے زمین پر سوئیں گے۔"

زلیخا بیگم' مولانا آزاد کی بیگم تھیں اور بالی گنج کی یہ کوٹھی مولانا کی رہائش گاہ جس کا نچلا حصہ ایک ترک خاندان نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس سے جو کرایہ آتا تھا' اس سے مولانا کا گھر چلتا تھا۔ کوٹھی کا کرایہ وہ کتابوں وغیرہ سے ہونے والی آمدنی سے ادا کردیا کرتے تھے۔

ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ کوٹھی کے نچلے حصے سے کسی نے آواز دے کر کہا "کچھ لوگ آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم مولانا کے گھر کی تلاشی لیں گے۔"

مولانا کے سسر نے کہا کہ وہ نیچے جاکر دیکھتے ہیں لیکن زلیخا بیگم نے انہیں روک دیا "انہیں اوپر آنے دو۔ تلاشی کے لیے رکھا کیا ہے' انہیں تلاشی لینے دو۔"

کچھ دیر میں سادہ کپڑوں میں چار پولیس والے اوپر آگئے۔

"ہمیں تلاشی لینی ہے۔"

"بھائی' یہاں تلاشی کے لیے کتابوں کے سوا رکھا کیا ہے؟"

"مولانا آزاد' حکومت کے خلاف جو کچھ لکھتے رہے ہیں' ہمیں ان کاغذوں کی تلاش ہے۔"

"آپ میں سے کوئی ہے جو مولانا کی تحریروں کو سمجھ سکے؟" مولانا کے سسر نے کہا۔

یہ جملہ ذرا سخت تھا جس پر آنے والوں کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور تلاشی لینی شروع کردی۔ لکھا ہوا جو کاغذ بھی ان کے سامنے آیا اسے اپنی فتح کی تحویل میں لیتے چلے گئے۔ پھر چند مسودے جو ایک ساتھ اوپر تلے رکھے تھے' ان کے ہاتھ لگے۔

"یہ قرآن کی تفسیر ہے۔ اس میں کوئی خطرناک بات نہیں ہے" مولانا کے سسر نے انہیں ٹوکا۔

"آپ بہت بول رہے ہیں۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ کس چیز کو خطرناک قرار دیتی ہے۔"

انہوں نے ان مسودوں کو اٹھایا اور کاغذوں کے اس

ڈھیر میں شامل کردیا جنہیں وہ جمع کرتے جارہے تھے۔ الماریوں سے کتابیں نکال کر پھینک دیں اور کاغذوں کے بنڈل بنا کر ساتھ لے گئے۔ حسبِ قاعدہ نہ تو ان پر گواہوں کے دستخط ہوئے نہ ان کی رسید تفصیل کے ساتھ مرتب کرکے دی گئی۔ ایک چھپا ہوا فارم اپنے ساتھ لائے تھے جس پر یہ تحریر لکھ دی "متفرق قلمی کاغذات لیے گئے۔"

جن کو یہ لوگ متفرق کاغذات کہہ رہے تھے' ان مسودات میں حسبِ ذیل کتابیں ایک حد تک مرتب تھیں۔

"تاریخ مغزلہ' سیرت شاہ ولی اللہؒ' دیوانِ غالب پر تبصرہ' خصائص مسلم' امثال القرآن' شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ' مقدمۂ تفسیر کے ناتمام اجزا' ترجمان القرآن کا مسودہ سورہ ھود تک۔ تفسیر البیان' سورہ نساء کے ابتدائی حصے تک' مضامین اور یادداشتوں کا ذخیرہ ان کے علاوہ۔

ان تلاشی لینے والوں کو یہ علم بھی نہ ہوسکا کہ وہ علم و ادب کا کتنا بڑا خزانہ اپنے ساتھ لے جارہے ہیں۔

"مولانا کو یہ کوئی نہ بتائے کہ یہاں کیا قیامت گزر گئی ہے۔ وہ جیل میں ہیں' کر تو کچھ نہیں سکیں گے لیکن اس متاعِ عزیز کے چھن جانے کا صدمہ انہیں بے حال کردے گا۔" زلیخا بیگم نے کہا۔

"ان کی طرف سے تقاضے ضرور آئیں گے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔"

"بہانوں کے سوا ہمارے پاس کیا رہ گیا۔ کسی نہ کسی طرح ٹالتے رہیں گے۔ کیا خبر اس وقت تک کاغذات واپس مل جائیں۔"

مولانا جیل میں تھے کہ چوراچوری کے مقام پر فساد ہوگیا۔ پولیس نے مظاہرین سے بچنے کے لیے تھانے میں پناہ لی۔ مظاہرین نے تھانے کو آگ لگادی۔ تمام پولیس والے زندہ جل مرے۔

اس ہولناک واقعے نے گاندھی کو سول نافرمانی کی تحریک واپس لینے پر مجبور کردیا۔ اس وقت کانگریس کی اعلیٰ قیادت جیلوں میں بند تھی۔ انہوں نے اپنی قربانیوں کا یہ حشر ہوتے ہوئے دیکھا تو سخت برہم ہوئے۔

مولانا آزاد جیل کی سختیوں سے لڑ رہے تھے لیکن گاندھی جی کے اس طرح پیچھے ہٹ جانے سے انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ "گاندھی جی استعماریت کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے ہیں۔ اس کا خمیازہ انہیں جلد بھگتنا پڑے گا" انہوں نے دیواروں کو اپنا مخاطب بنایا اور سر جھکالیا۔

عدم تعاون کی تحریک انتشار کا شکار تھی۔ اب حکومت کو کسی ردِعمل کا کوئی خوف نہیں تھا۔ راستہ ہموار دیکھ کر گاندھی کو گرفتار کرکے چھ سال کی سزا سنادی۔

مولانا کا کہا ٹھیک ثابت ہوا۔ اب گاندھی کے حق میں بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ خالی سڑکوں سے پولیس لاری گزرتی چلی گئی اور جیل کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ آہنی گیٹ کھلا اور یہ گاڑی گاندھی کو لے کر جیل کی ایک بیرک کے سامنے رک گئی۔

مولانا آزاد جنوری ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے تو سیاسی منظرنامہ تبدیل ہوچکا تھا۔ تحریکِ عدم تعاون دم توڑ چکی تھی۔ مسلمانوں کا جوش و خروش سرد پڑ چکا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد جس سے برطانوی استعمار لرزہ براندام تھا نہ صرف ختم ہوچکا تھا بلکہ اس کی جگہ ہندو مسلم فسادات شروع ہوچکے تھے۔ خود کانگریس دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ "الہلال" اور "البلاغ" کی شعلہ بار تحریروں نے جو سیاسی نقشہ ترتیب دیا تھا' وہ بکھر چکا تھا۔ ایک اکیلے مولانا آزاد نے مسلمانوں کی جمعیت کو جس طرح تحریکِ آزادی سے قریب تر کردیا تھا' اب اس کا نام و نشان بھی نہیں رہا تھا۔

انہوں نے صبر کیا لیکن صبر اس وقت کچا دھاگا بن گیا جب ان کی اہلیہ نے انہیں تلاشی کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ وہ یوں سن رہے تھے جیسے کوئی کسی عزیز کی موت کا احوال سنتا ہے۔

"زلیخا' جانتی ہو' ان کاغذوں میں کیا تھا۔ یہ میرے دماغ کا حاصل اور میری زندگی کا سرمایہ تھا۔ یہ ذخیرہ رہ جاتا' میں نہ رہتا۔ کم از کم ماتم کی زحمت سے تو بچ جاتا۔"

"ہمت سے کام لیں۔"

"ہمت کہاں سے لاؤں۔ یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ ہے جو جامِ حوادث نے میرے لبوں سے لگایا ہے۔"

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

"خدا کے کاموں میں کس کو دخل۔ اس آزمائش میں بھی کوئی بہتری ہوگی" ان کی اہلیہ نے پھر انہیں تسلی دی۔

"نہیں۔ غلطی میری ہے۔ سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ میں نے چاہا دونوں کو بہ یک وقت جمع کردوں۔ میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا۔ دوسری طرف برقِ خرمنِ سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں۔"

"آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسے مایوس تو آپ کبھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پر آپ کی پریشانی ظاہر ہے لیکن آپ کا حافظہ اور ذہن تو کوئی نہیں لے گیا۔ آپ پھر لکھنے بیٹھ جائیے۔"

"لکھی ہوئی چیزوں کو دوبارہ لکھنے کی مشکل جانتی ہو؟ جبکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ پھر کب یہ متاع چھن جائے لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں کہ از سرِ نو محنت کی جائے۔"

وہ لکھنے کا وقت کیا نکالتے کہ سیاسی مصروفیات منہ کھولے کھڑی تھیں۔ کانگریس کے دونوں دھڑوں میں کھلا تصادم تھا اور اسے روکنا وقت کی سب سے اہم ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے ستمبر ۱۹۲۳ء کو دہلی میں کانگریس کا خصوصی اجلاس بلایا گیا۔ مقصد موجودہ نازک صورتِ حال کا جائزہ لینا تھا۔

اس اجلاس میں دونوں فریق شامل تھے۔ ان دونوں دھڑوں نے مولانا کو کانگریس کا صدر چن لیا۔ مولانا آزاد کانگریس کے سب سے کم عمر صدر رہے۔

مولانا نے اس اجلاس میں جس دور اندیشی کا مظاہرہ کیا اس نے کانگریس کو تقسیم ہونے سے بچالیا۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"ہمارا اصل مقصد ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانا ہے۔ ہم ۱۹۱۹ء سے اس بارے میں عملی احتجاج کر رہے ہیں۔ اب اگر بعض حضرات قانون ساز اسمبلیوں میں جانا چاہتے ہیں تو اس کی انہیں مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ جن کی رائے اس سے مختلف ہے وہ بھی اپنی صوابدید کے مطابق کر سکتے ہیں۔ بہرحال دونوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔"

دونوں فریقوں میں یہی جھگڑا تھا۔ ایک طرف گاندھی کے پیروکار تھے جو اسمبلیوں میں داخلے کے خلاف تھے۔ اس کے برعکس نہرو داخلے کے حامی تھے۔ مولانا کی دانش مندی نے کانگریس کو دولخت ہونے سے بچالیا۔

برطانوی استعمار اپنی سازش میں پوری طرح کامیاب ہو چکا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ شدھی اور سنگٹھن تحریکیں وجود میں آگئیں۔ اب مطالبات ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر کم اور فرقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے زیادہ ہونے لگے۔ گویا انگریز نے ہندوستانیوں کو بڑے کاموں سے ہٹا کر چھوٹے چھوٹے کاموں پر لگادیا۔

مولانا کی دن رات کی کوششیں بھی کام نہ آسکیں۔ حالات سے دل برداشتہ ہو کر وہ ایک مرتبہ پھر تصنیف و تالیف کی طرف لوٹ آئے۔ انہوں نے اپنے کاغذات کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ معلوم ہوا ایک عرصے تک یہ کاغذات پولیس کمشنر کے دفتر میں پڑے رہے تھے۔ اتفاق سے وہاں آگ لگ گئی۔ دفتر کے سامان کے ساتھ بعض اوراق بھی جل گئے۔ آگ بھی اسی وقت لگنی تھی جب یہ دفتر پریشاں وہاں جمع تھا۔ بہرحال بچے کھچے کاغذات ایک عرصے کی خط و کتابت کے بعد انہیں مل گئے لیکن یہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پارہ پارہ تھے۔

وہ ان اوراق کو لے کر بیٹھے لیکن جوں ہی ان برباد شدہ کاغذات پر نظر پڑی' ملال تازہ ہو گیا۔ قلم نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ایسا بارہا ہوا اور وقت گزرتا رہا۔ طبیعت اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی تھی کہ لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھا جائے لیکن ایک ایسے کام کی طرف سے جو مسلمانوں کے لیے وقت کا سب سے ضروری کام تھا' زیادہ تر طبیعت غافل بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس ضرورت کا احساس ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

۱۹۲۷ء کا قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی۔ دماغ کی گرہیں کھلنے لگیں۔ پھر تو یہ معلوم ہوا گویا اس شورش کدے افسردگی کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ یا تو یہ حال تھا کہ ایک سطر لکھنا محال تھا یا اب قلم روکنا دشوار تھا۔ سیاسی مشغولیات بدستور حائل تھیں تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورۃ کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گئے۔

○☆○

"برطانوی حکومت' ہندوستان کی جسمانی' اقتصادی' روحانی' مالی اور اخلاقی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ میں نے خود کبھی بادشاہ کی وفاداری کی تھی اور لوگوں کو اس کی اطاعت پر کمربستہ کیا تھا لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اسی حکومت کو راہِ راست پر لانے کے لیے گفت و شنید اور درخواست گزاری کا طریقہ کار آمد نہیں رہا۔ اب اس حکومت سے بغاوت میرا مذہب اور ایمان ہو گیا ہے۔"

سابرمتی آشرم سے روانہ ہوتے وقت' مہاتما گاندھی' اخباری نمائندوں سے باتیں کر رہے تھے۔ یہاں سے چل کر انہیں ساحلی بستی' ڈانڈی پہنچنا تھا۔ ان کے رضاکار ان کے ہمراہ تھے۔

حکومت نے نمک جیسی روزمرہ کے استعمال کی چیز پر ٹیکس لگایا تو سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے کرنے والی قوم کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہونے لگے۔ ایک موقع اور آگیا تھا کہ حکومت پر دباؤ ڈالا

جائے۔ مولانا آزاد جو اَب تک کانگریس کے صدر رہونے کے باوجود تمام معاملات سے لاتعلق رہے تھے، ایک مرتبہ پھر سرگرم عمل ہوگئے۔ انہوں نے گاندھی سے ملاقات کی اور انہیں نمک بناکر قانون شکنی پر آمادہ کیا۔ گاندھی اس پر رضامند ہوگئے اور انہوں نے نمک سازی کی تحریک شروع کرکے نمکین ستیہ گرہ کے نام سے اس تحریک کا آغاز کردیا۔ بالآخر ۶ اپریل کو ڈانڈی پہنچ کر، نمک بنایا اور یوں قانون شکنی کا برملا اظہار کیا۔

"ہوائیں انسان کے لیے خدا کا پیغام ہیں۔ سمندر کا پانی غیر ملکی نہیں۔ ان پر ہمارا پورا حق ہے۔ اگر ہم ان کے پانیوں سے نمک بناتے ہیں تو یہ ہرگز جرم نہیں۔ اگر حکومت اس پر پابندی لگاتی ہے، گرفتاری کرتی ہے، مقدمہ چلاتی ہے تو میں کہتا ہوں، اس صورت میں عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ گرفتار ہونے کی صورت میں نہ ضمانت دی جائے نہ مقدمے کی کارروائی میں حصہ لیا جائے۔ بنیادی حقوق کے لیے لڑنا اور مرجانا ہمارا ایک مقدس فرض ہے۔"

اس تحریک کے تحت جگہ جگہ نمک سازی کی جانے لگی۔ چار ماہ کے اندر اتنی گرفتاریاں ہوئیں کہ جیلوں میں جگہ نہ رہی۔ گورا.... فوج نے کئی سو خدمت گاروں کو بھون ڈالا۔

گاندھی جی کو رات کے سناٹے میں گرفتار کرکے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پہنچادیا گیا۔ حکومت کے اندازے غلط نکلے۔ پورے ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ مدراس، امرتسر اور بنگال کے جنوبی شہروں میں پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ شولاپور میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ صوبہ سرحد میں بھی سیاسی انقلاب رونما ہوا۔ تحریکِ آزادی کی لگن نے زور پکڑا اور اس کے اثرات پورے صوبے میں پھیل گئے۔

حکومت اس کامیابی پر بپھر گئی تھی۔ اس نے کانگریس کو خلافِ قانون جماعت قرار دے کر اس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ارکان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ایک کے بعد ایک صدر اور اس کے ارکان گرفتار ہونے لگے۔

مولانا آزاد میرٹھ کا دورہ مکمل کرکے کلکتہ پہنچے ہی تھے کہ انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ انہیں فرنٹی سارہنوں کی حفاظت میں بذریعہ ریل، مکنیر اور پھر کار کے ذریعے میرٹھ جیل لایا گیا۔ یہاں انہیں چار ماہ رکھنے کے بعد گونڈہ جیل بھیج دیا گیا۔

گونڈہ جیل کی بیرکوں میں چاروں طرف در بنے ہوئے تھے۔ ان دروں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ نہایت فراٹے کی ہوا بیرک میں داخل ہوتی تھی۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی شباب پر تھی۔ دن تو جوں توں گزر گیا۔ یخ بستہ ہوا اندر آرہی تھی۔ مولانا دائمی نزلے کا شکار تھے۔ سردی ان کے لیے خطرناک ہوسکتی تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اپنے اپنے کمبل دروں پر لٹکادو۔ یہاں ایک شخص عبداللطیف بجنوری تھا، وہ اس وقت سے ان کا خدمت گار بنا ہوا تھا جب سے مولانا یہاں آئے تھے۔ اس وقت بھی وہی ان کے کام آیا۔ وہ آگے بڑھا اور کمبلوں سے ہوا روک دی۔ اس کے باوجود ہوا کی منہ زوری میں کمی نہیں آئی۔ عبداللطیف کی بے چینی دیکھی نہیں جارہی تھی۔ کبھی وہ کمبلوں کے پاس جاکر کھڑا ہوجاتا، کبھی مولانا کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔

"بجنوری، کوئی بات کرو۔ باتوں میں سردی کا احساس کم ہوجائے گا اور رات بھی کٹ جائے گی۔"

"مولانا، میں آپ کا ایک خاموش عقیدت مند ہوں۔ برسوں کی آرزو تھی کہ آپ کی خدمت کا موقع ملے۔ شاید میری دعاؤں کا اثر ہے کہ آپ جیل میں آگئے اور اب میں آپ کے اتنے قریب بیٹھا ہوں۔"

مولانا کو ہنسی آگئی "میرے بھائی، اگر دو چار لوگوں کی اور دعا لگ گئی تو میں تو ساری عمر جیل ہی میں رہوں گا۔"

بجنوری کو بھی احساس ہوا کہ اس نے کیا کہہ دیا۔ وہ بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اس دوران میں اس نے بیڑی نکالی اور منہ سے لگالی اور پھر باتیں کرنے لگا۔

گونڈہ جیل کے حکام کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مولانا کو جیل میں سگریٹ پینے کی خصوصی اجازت ہے۔ اس لیے انہوں نے مولانا کا سگریٹ کیس رکھ لیا تھا۔ مولانا ہمیشہ مصری سگریٹ پیتے تھے اور کثرت سے پیتے تھے۔ سگریٹ کے بغیر ان کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔

"بجنوری، ہمارے پاس سگریٹ ختم ہوگئے۔"

"سرکار، میرے پاس تو بیڑی ہے۔ حضور والا شوق فرمانا پسند کریں تو بیڑی حاضر ہے۔"

"میرے بھائی، بیڑی ہی سے کام چلایا جائے گا۔"

مولانا کی نفاست ضرب المثل تھی لیکن اس وقت جیل کی کوٹھری میں بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ بجنوری کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور جب اسے مولانا نے یہ بتایا کہ مولانا کو جیل میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے، اس کے باوجود جیل کے حکام اجازت نہیں دے رہے ہیں تو اس نے صبح ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہنگامہ کھڑا کردیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ تک بات پہنچی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرٹھ جیل سے

معلوم کرے گا۔ اس نے فوراً تار دیا اور جواب آنے پر مولانا کو اجازت مل گئی۔ بیڑی کا شغل ختم ہوگیا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ بجنوری بھی ان کے سگریٹوں میں شریک ہوگیا۔
سگریٹ پہنچنے لگے تو مولانا کا دماغ بھی کام کرنے لگا۔ انہوں نے قلم سنبھال لیا۔ ترجمان القرآن کا دیباچہ جیل میں رہ کر مکمل کیا۔

۲۵ فروری ۱۹۳۱ء کو کانگریس۔۔کو خلافِ قانون قرار دینے کا حکم واپس لے لیا گیا۔ گاندھی جی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو رہا کرنے کے احکام صادر ہوئے۔ مولانا آزاد کو بھی رہائی مل گئی۔

جیل سے نکلتے ہی انہوں نے ترجمان القرآن کی اشاعت کے انتظامات شروع کردیے۔ کاغذ کی خریداری، کتاب کا خرچ، پریس کا معاوضہ۔ یہ سب ایسے اخراجات تھے جن کے وہ متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ دال اور سبزیوں پر گزارا تھا۔ بعض عقیدت مندوں سے قرض حسنہ لیا۔ پریس والے سے معاہدہ ہوگیا کہ کتاب کی اشاعت کے بعد معاوضہ ادا کردیں گے بہرحال کسی نہ کسی طرح عصرِ جدید کی ترجمانی کرنے والی یہ تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے نام سے شائع ہوگئی۔ یہ پہلی جلد تھی۔ اب انہیں دوسری جلد کی تیاری کرنی تھی۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کتاب کی اشاعت کے لیے انہیں رہائی ملی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کام سے نمٹے، انہیں دہلی سے گرفتار کرلیا گیا لیکن صرف دو مہینے بعد رہائی نصیب ہوگئی۔
اب انہیں ترجمان القرآن کی تیسری جلد کی تیاری کی فکر تھی لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد دو اڑھائی سال ان کے لیے کسی قدر عدیم الفرصتی کا زمانہ تھا۔ تیسری جلد کے چند صفحات سے آگے کام بڑھانے کا وقت ہی میسر نہ آسکا۔

۱۹۳۷ء میں صوبہ جاتی خودمختاری کے تحت پہلے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے پنجاب، آسام، بنگال اور سندھ کے سوا ہر جگہ وزارتیں قائم کیں۔ مسلمان وزیروں کے نگراں مولانا ہی تھے۔ مسلم لیگ نے کانگریس کی وزارتوں کے خلاف مورچا جمایا تو ان کے مشاغل میں اور اضافہ ہوگیا۔ ادھر دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء) شروع ہوگئی۔ ہندوستان سیاسی دوراہے پر کھڑا تھا۔ حکومت نے آرمی ایکٹ پاس کردیا کہ امورِ جنگ کی مخالفت مستوجب سزا ہے۔ وائسرائے نے بھی وزارتوں سے پوچھے بغیر اعلان کردیا کہ ہندوستان برطانیہ کے ساتھ ہے۔ چونکہ ہندوستان غلام تھا اس لیے اسے جنگ میں جھونک دینا جائز تھا۔

کانگریس ایک زبردست معرکے کے موڑ پر تھی۔ ہندوستان جنگ میں شریک ہو یا اپنی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو؟ یہ سوال تھا کہ اس فیصلہ کن دور میں کانگریس کا صدر کون ہو۔ سب کی نگاہیں مولانا آزاد کی طرف اٹھیں اور وہ کانگریس کے صدر ہوگئے۔ اب ان کی فرصت کے لیے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کا کم پڑجانا لازمی تھا۔
مولانا نے صدر بنتے ہی اپنے خطبے میں اعلان کردیا کہ ہندوستان صرف اس صورت میں جنگ میں شریک ہوسکتا ہے جب اسے آزادی دی جائے۔ یہ کہہ کر انہوں نے انگریز سے بھی لڑائی مول لے لی اور گاندھی سے بھی۔ گاندھی کسی حالت میں بھی جنگ نہیں چاہتے تھے۔
اس اختلاف نے خود کانگریس میں دو گروپ بنادیے اور مولانا ان دونوں گروپوں کے درمیان گردشِ روزگار کا تماشا بنے ہوئے تھے۔ انہی دنوں وہ پونا میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس سے لوٹے تھے کہ وائسرائے نے انہیں طلب کیا تاکہ کانگریس کو حکومت میں شامل کرنے پر بات چیت ہوسکے۔ مولانا نے نہایت حقارت سے اس کی دعوت کو ٹھکرادیا اور ملاقات سے انکار کردیا۔
کانگریس آزادی کی خواہاں تھی اور حکومت اسے اپنے مفاد میں نہیں سمجھتی تھی۔ مجبور ہوکر کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ کا اعلان کیا۔ مولانا حکومت کے خلاف زیادہ وسیع تحریک چلانا چاہتے تھے لیکن گاندھی انفرادی ستیہ گرہ سے آگے بڑھنے کے حق میں نہیں تھے۔
مولانا پنجاب سے لوٹ رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا کہ گاڑی نے الہ آباد ریلوے اسٹیشن کے قدم چومے۔ مولانا کو چائے کی طلب ہوئی۔ انہوں نے صبح کا پہلا سگریٹ جلایا اور چائے پینے ریفریشمنٹ روم میں چلے گئے۔ ابھی انہوں نے چائے ختم بھی نہیں کی تھی کہ اپنے سامنے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو دیکھا۔
''آداب!''
''آداب'' مولانا نے جواب دیا۔
''حضور، یہ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔''
مولانا وارنٹ دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوئے ''آپ نے مجھے یہ اعزاز دے کر بڑی عزت بخشی ہے کہ آپ مجھے گرفتار کررہے ہیں، حالانکہ ابھی مجھے انفرادی ستیہ گرہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔''
انہیں دو برس کی سزا دے کر نینی تال جیل پہنچادیا گیا۔
جنگ کی حالت نہایت تیزی سے الٹ پلٹ ہو رہی

تھی۔ اتحادیوں کو شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ یورپ اور ایشیا میں جنگ نے شدت اختیار کرلی تھی۔ جرمنی نے روس پر حملہ کردیا تھا ادھر ایشیا میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کرکے امریکا کے اٹھاسی ہوائی جہاز تباہ کردیے۔ سمندر میں کھڑے اٹھارہ بحری جہاز ڈبودیے۔ اس صورتِ حال پر امریکی حکومت کو سخت تشویش ہوئی۔ اس نے حکومتِ برطانیہ پر پہلے سے زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ ہندوستان کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے طے کرے تاکہ وہاں کے لوگ جنگ کی مساعی میں شامل ہونے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۱ء میں مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کو ایک ساتھ رہا کردیا گیا۔

رہائی کے بعد ملاقاتوں اور مذاکرات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا لیکن ہر مرتبہ یہی احساس ہوا کہ برطانیہ' ہندوستان کو آزادی دینے میں ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔ مولانا نے حکومت پر آخری ضرب لگانے کے لیے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ ۱۴ جولائی کو اور پھر ۵ اگست کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوئے۔ مولانا نے اس موقع پر کہا۔ "اب صورتِ حال یہ ہے کہ جاپان ہمارے دروازے تک آگیا ہے۔ برطانیہ اگر مناسب سمجھے تو ہندوستان چھوڑدے جیسے اس نے سنگاپور' ملایا اور برما کو چھوڑدیا لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گروہوں ہندوستانی اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ یہ ان کا وطن ہے۔"

"ہندوستان چھوڑدو" کی تحریک اور اس کی گونج گلی گلی پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ قرارداد بھی پاس کرائی کہ عالمی رائے عامہ کو ہموار کیا جائے اور عالمی طاقت کے جید رہنماؤں کو خطوط لکھ کر بتایا جائے کہ ہندوستان چھوڑدو سے ہماری مراد انتقالِ اقتدار ہے۔

اس قرارداد کو منظور کرانے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں رکھا گیا۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ریزولیشن تیار کرلیا گیا تھا جس کی منظوری ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو ہونے والے اجلاس میں لینی تھی۔

بمبئی شہر کے قلب گوالیہ ٹینک پر تیس ہزار مربع فٹ پر دہرے شامیانے نصب کیے گئے تاکہ ممکنہ بارش سے بچا جاسکے۔ تین سو ملکی اور غیر ملکی صحافیوں کے لیے انتظام تھا۔ ساڑھے سات ہزار مندوبین کو ٹھہرانے کا الگ بندوبست تھا۔

جمعے کا دن تھا لہٰذا نمازِ جمعہ کے بعد تقریباً ڈھائی بجے یہ تاریخی اجلاس شروع ہوا۔ بارش کے باوجود شامیانے بھرجانے کے بعد باہر پانچ ہزار سے زائد کا مجمع تھا۔

مولانا ابوالکلام کی صدارت کا اعلان ہوا اور انہوں نے اپنی کرسی سنبھالی۔ بندے ماترم کے نغمے کے ساتھ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد سابقہ اجلاس کی کارروائی پیش کی گئی۔ اس کے بعد مولانا کا خطاب ہونا تھا۔ مجمع دم سادھے بیٹھا تھا۔ خطاب ان کا ہو اور ایسے نازک موقع پر۔ دیکھیے بجلی کس کس پر گرتی ہے۔ بارش کا زور تھم گیا تھا۔ مولانا گونج رہے تھے جیسے بارش میں وقفہ آجانے کے بعد بادل گرجتے ہیں۔

"محاذ آرائی ہندوستان پر مسلط کی گئی ہے حالانکہ یہاں کے عوام کی خواہش تھی کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ مل کر جنگ میں اتحادیوں کے شانہ بشانہ لڑیں۔ ہمیں ہندوستان کی آزادی کا اعلان فوری درکار ہے۔ ہم اپنی طرف سے اقوامِ متحدہ کے ساتھ اتحاد میں فوراً شامل ہوں گے۔ ہمارا واحد مقصد جنگ لڑنا اور فتح حاصل کرنا ہوگا۔"

مولانا کی یہ تقریر سوا منٹ تک جاری رہی۔ اس کے بعد ہندوستان کی آزادی کے بارے میں تاریخی قرارداد رائے شماری کے لیے پاس ہوئی۔ کمیونسٹوں کے سوا تمام ممبروں نے ورکنگ کمیٹی کے تیار کیے ہوئے ریزولیشن کا بھرپور خیرمقدم کیا۔

دو روز کی بحث وتمحیص کے بعد ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو ریزولیشن بھاری اکثریت سے منظور ہوگیا۔

اجلاس ختم ہوا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مولانا کو جاگتے ہوئے کئی دن ہوگئے تھے۔ آنکھوں میں نیند ہلکورے لے رہی تھی۔ بمبئی پہنچتے ہی انفلوئنزا ہوگیا تھا لہٰذا طبیعت ابھی تک ناساز تھی۔ دماغی تھکن الگ تھی لیکن یہ خوشی تھی کہ جو چاہا تھا وہ ہوگیا۔ ان کی گاڑی شامیانے کے دروازے پر آکر رکی اور وہ بھولا بھائی کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔

بھولا بھائی ڈیسائی ان کی طرف سے سخت متفکر تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے "آپ کہیں روپوش ہوجائیں۔"

"کیوں؟ میں نے کیا' کیا ہے جو میں روپوش ہوجاؤں؟" مولانا نے شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی ایک صاحب یہ خبر دے کر گئے ہیں کہ آپ کی گرفتاری کے لیے تمام انتظامات مکمل ہوگئے ہیں۔ آج رات کسی بھی وقت یہ معاملہ پیش آسکتا ہے۔"

"بھولا بھائی' دو ہفتے ہوگئے ہیں۔ مجھے یہ افواہیں سنتے

سنتے۔ ان خبروں کا اعتبار کیا اور اگر ان میں صداقت ہے بھی تو کیوں نا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرلیا جائے۔"

مولانا نے کھانا کھایا۔ نیند ایسی تھی کہ دسترخوان پر ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بہ مشکل اپنے بستر تک گئے اور بے خبر سوگئے۔ ان کا میزبان سوچ رہا ہوگا' عجیب بے فکرا آدمی ہے۔

حسب معمول علی الصباح آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی' صبح کے چار بجے تھے۔ سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا تھا لہٰذا اسپرین کی دو گولیاں منہ میں ڈالیں اور چائے پی لی۔ کچھ دیر بعد سرگرانی کم ہونے لگی۔ شاید ابھی نیند پوری نہیں ہوئی تھی کہ آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔ وہ پھر بستر پر چلے گئے۔ آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر یہ شور قریب آ گیا۔ پھر ایسا لگا جیسے کئی کاریں مکان کے احاطے میں داخل ہوئی ہیں۔ اسے نیند کی حالت میں یہ خیال آیا کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے اس کا پاؤں دبایا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میزبان کا بیٹا دھیرو ان کی پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔

"دو فوجی افسر' ڈپٹی کمشنر کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔"

مولانا نے وہ کاغذ دیکھا۔ یہ ان کی گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ "مجھے تیاری میں ڈیڑھ گھنٹا لگے گا' ان سے کہہ دو میرا انتظار کریں۔"

دھیرو چلا گیا اور انہوں نے غسل خانے کا رخ کیا۔ غسل کیا' کپڑے بدلے اور چند ضروری خطوط لکھے۔ معاً انہیں اپنی اہلیہ کا خیال آیا۔ ان سے ملے بغیر وہ اکثر جیل چلے گئے تھے لیکن اس مرتبہ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب کبھی ان سے ملنا نہ ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جب وہ کلکتہ سے چلے تھے' وہ بہت بیمار تھیں۔ ان کا مایوس چہرہ مولانا کے سامنے گھوم گیا۔

"میں تیار ہوں" مولانا نے برآمدے میں آکر ڈپٹی کمشنر سے کہا پھر بھولا بھائی کی طرف دیکھا "آپ کے دوست جو خبر لائے تھے' وہ صحیح نکلی۔"

مولانا ڈپٹی کمشنر کی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت صبح کے چھ بج چکے تھے۔ نسیم صبح کے جھونکے انہیں الوداع کہنے کے لیے ساتھ ساتھ چل رہے۔

وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن فوجی پہرے کے حصار میں تھا۔ مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی انتظار میں کھڑی آنکھیں جھپک رہی تھی۔ مولانا کو ایک ڈبے میں بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے عادت کے مطابق کھڑکی کے قریب کی سیٹ منتخب کی۔ اس کے فوراً بعد پنڈت نہرو' آصف علی اور ڈاکٹر محمود فوجیوں کے نرغے میں دکھائی دیے۔ جواہر لال سے معلوم ہوا کہ گاندھی جی بھی گرفتار کر کے لائے گئے ہیں۔ انہیں دوسرے ڈبے میں بٹھایا گیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے نو اور ممبر پٹنہ سے گرفتار کر کے لائے گئے ہیں۔

گرفتاریوں کی خبر کسی نہ کسی طرح پونا پہنچ چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر پولیس ہی پولیس تھی البتہ پل کے اوپر لوگوں کا ہجوم تھا۔ گاڑی جیسے ہی اسٹیشن پر پہنچی' فلک شگاف نعروں سے اسٹیشن گونج اٹھا "مہاتما گاندھی کی جے" ان نعروں نے کمشنر کو برہم کر دیا۔ اس نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دے دیا۔ بس پھر کیا تھا' پولیس کی بھاری نفری ہجوم پر ٹوٹ پڑی۔ پنڈت نہرو نے یہ منظر دیکھا تو ڈبے سے باہر کود گئے۔

"تمہیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

پولیس کمشنر ان کے پیچھے لپکا اور انہیں ڈبے کی طرف دھکیلنے لگا۔ اسی وقت ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر شنکر راؤ دیو بھی پلیٹ فارم پر آ گئے اور اتنے مشتعل ہوئے کہ کئی پولیس والوں کی وردیاں پھاڑ دیں۔ پولیس نے انہیں اٹھا کر ڈبے میں ڈال دیا۔ پنڈت نہرو کسی قیمت پر اپنے ڈبے میں آنے کو تیار نہیں تھے۔ مولانا نے پکار کر انہیں اندر آنے کو کہا اور انہوں نے کہنا مان لیا۔

پولیس کمشنر تھوڑی دیر بعد کمپارٹمنٹ میں آیا اور معذرت کی "مجھے سخت افسوس ہے مگر مجھے لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا ہے اور میں اس حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔"

"ہم نیتا بھی اپنی عوام کو پولیس کے ہاتھوں پٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر فوراً تم نے لاٹھی چارج نہ بند کرایا ہوتا تو میں اور میرے ساتھی نیچے سپاہیوں سے گتھم گتھا نظر آتے۔"

پولیس کمشنر معذرت کر کے چلا گیا اور مولانا کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ چند باوردی سپاہی مہاتما گاندھی اور سروجنی نائیڈو کو ڈبے سے اتار کر لے جا رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں آغا خاں کے محل میں نظربند کیا گیا ہے۔

پہلے سب کو یہی گمان تھا کہ منزل پونا ہے لیکن جب گاڑی یہاں سے روانہ ہوئی تو ماتھا ٹھنکا۔ گاڑی ایک غیر آباد اسٹیشن پر رکی اور چند رہنما اتار لیے گئے۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو کسی نے اترنے کے لیے نہیں کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہمیں احمد نگر لے جایا جارہا ہے' اس راستے میں قلعہ احمد نگر کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی۔"

"چلو' یہ بھی اچھا ہی ہے" مولانا نے کہا "میں ہندوستان کے تمام تاریخی مقامات دیکھ چکا ہوں' احمد نگر کا قلعہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔"

گاڑی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ مولانا آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لے رہے تھے یا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہے تھے؟

پونا سے چل کر احمد نگر ڈھائی گھنٹے میں گاڑی پہنچی۔ اس وقت دن کے دو بجنے والے تھے۔ اسٹیشن پر سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی ٹہل رہے تھے۔ اسٹیشن سے قلعے تک کی مسافت بارہ منٹ میں طے ہوئی۔ آہنی گیٹ کے اندر وسیع احاطہ نظر آیا۔ پہلے موٹر لاریوں کی قطاریں' پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد چڑھائی تھی۔ مولانا کو کار سے نیچے اترنے کے لیے کہا گیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے ایران سیاست کی فہرست کمانڈنگ افسر کے حوالے کی۔ اب گویا ان لوگوں کی حفاظت فوج کی ذمے داری تھی۔

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے آیا۔ اس کے تینوں طرف بیرکوں کی طرح کمروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ کمروں کے سامنے پختہ برآمدہ تھا۔ بیچ میں کھلی جگہ تھی۔ صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترا تھا۔ احاطے کے شمال میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر تھی۔

قطار کا پہلا کمرا مولانا آزاد کے حصے میں آیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ ایک چارپائی پڑی ہے۔ کمرے میں اور کیا ہے' یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ جانے کب کی نیند اور تھکن تھی۔ تکیے پر سر رکھا تو گہرا اور قید خانے کا فرق ہی مٹ گیا۔ رات بھر بے ہوشی کی نیند سوتے رہے۔ حسبِ معمول صبح چار بجے آنکھ کھلی۔ صبح کی سپیدی کے آنچل میں چھپا ہوا ہر منظر حسین لگتا ہے۔ قلعے کے در و دیوار بھی انہیں کسی اور دنیا میں لے گئے۔ یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر بابر بہان شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے۔"

ان سمیت اس قلعے میں دس افراد لائے گئے تھے۔ پنڈت نہرو کا کمرا ان کے برابر تھا۔ اس کے بعد بیرسٹر آصف علی تھے۔ سب سے آخر کا کمرا ڈائننگ روم تھا۔ قلعے کا انتظام فوج کے ہاتھ میں تھا البتہ جیلر پونا سے آیا تھا۔

اب ان کے کمرے کے روشن دان سے دھوپ چھن چھن کر اندر آنے لگی تھی۔ کاش! کوئی آواز بھی آتی۔ قلعے کی سنگین دیواریں کسی آواز کے حق میں نہیں ہیں۔ کبھی کبھی کسی فوجی کے بوٹوں کی دھمک یا کھانسنے کی آواز آجاتی تھی۔ ان کے ساتھیوں میں سے ابھی کوئی سو کر نہیں اٹھا تھا۔ سب اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بستر سے اٹھنے کی ہمت نہیں تھی ورنہ سو کون رہا ہوگا۔

مولانا کئی مرتبہ احاطے میں گھوم پھر کر آچکے تھے۔ ڈائننگ روم میں جاکر ناشتے سے نمٹ چکے تھے۔ جیلر سے مل کر اپنی اصطلاح میں لب سوز اور لب بند قسم کی چائے کا انتظام انہوں نے اپنی کمرے ہی میں کرلیا تھا۔ وہ جیسمین یا سفید چائے کے عادی تھے جس سے ان کا فنجان بھرا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں پنڈت نہرو نے ان کے کمرے میں جھانکا پھر آصف علی آگئے اور پھر دوسرے ممبران بھی ان کے کمرے میں چلے آئے۔ چائے کا دور' باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر یہ روز کا معمول ہوگیا۔

یہ قلعہ بدترین قسم کی تنہائی تھا۔ بیرونی دنیا سے ہر تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ خط و کتابت ممنوع اور اخبارات موقوف تھے البتہ چند ماہ بعد اخبارات ملنے لگے تھے۔

اس تنہائی سے لڑنے کا ایک ہی علاج تھا۔ جب دوپہر کے وقت سب ساتھی اپنے اپنے کمروں میں ہوتے۔ ان کے کمرے کے روشندان میں بیٹھی ہوئی چڑیا کی چوں چوں کے سوا کوئی آواز نہ ہوتی تو وہ کسی دوست کو مخاطب کرکے خط لکھنا شروع کردیتے۔ ان خطوں کو پوسٹ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ان خطوں کو جمع کرتے رہے۔ جیل سے رہائی کے بعد ان خطوط کو "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع کیا گیا۔

زلیخا بیگم کو صرف یہ معلوم ہوسکا تھا کہ مولانا آزاد' دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ گرفتار کرلیے گئے ہیں۔ انہیں گرفتار کرکے کہاں لے جایا گیا ہے اور اب کس حال میں ہیں' انہیں کیا کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ کوئی کہتا تھا' انہیں جنوبی افریقہ لے جاکر نظربند کردیا گیا ہے۔ بعض لوگ ان کے توپ دم کیے جانے کی خبریں اڑاتے تھے۔ جنگ کا بادل الگ سروں پر منڈلا رہا تھا۔ جاپانی افواج رنگون تک آگئی تھیں۔ کلکتے پر حملے کا شدید خطرہ تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا' کل کیا ہوجائے؟

یہ باتیں ایسی نہیں تھیں جنہیں وہ نظرانداز کرکے

اطمینان حاصل کرلیتیں۔ مولانا کے گھر میں انہوں نے دیکھا ہی کیا تھا۔ پریشانیوں کے سوا ملا ہی کیا تھا۔ ایک مولانا کی محبت تھی جو انہیں ہر صدمے سے بے نیاز رکھتی تھی' اب وہی محبت ان سے اوجھل تھی۔

پچھلے دو سال سے دق کا مرض تعاقب کررہا تھا۔ ان خبروں نے ایسا پریشان کیا کہ مرض میں اچانک اضافہ ہوگیا۔ ہاتھ ایسا تنگ تھا کہ دوا اور غذا کی قدرت نہیں تھی۔ مولانا کو ایک نظر دیکھنے کی بھی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی چلی جارہی تھیں۔ ڈاکٹروں سے اپنی تکلیف بیان کرنے کے بجائے صرف اتنا کہتیں "خدا کے لیے ایک مرتبہ مولانا کو دکھادو۔"

کس کے بس میں تھا کہ قلعے کی سنگین دیواروں میں روزن بناتا۔ ان اسیروں پر تو باہر کی ہوا تک کے جانے پر پابندی تھی۔ ڈاکٹر تسلی دیتے تو وہ اس احساس سے آنکھیں بند کرلیتیں کہ اب وہ صورت خواب ہی میں نظر آسکتی ہے۔ ڈاکٹر سمجھتے' انہیں افاقہ ہورہا ہے لیکن مرض بڑھتا چلا گیا۔ آخر انہیں خود بھی یقین ہوگیا کہ اب وہ بچنے والی نہیں۔ انہوں نے مولانا کے سیکریٹری عبدالرزاق ملیح آبادی کو بلایا۔ وہ ملیح آبادی سے پردہ کرتی تھیں لیکن اس دن اصرار کرکے بلایا۔

"آپ میرے بھائی ہیں۔ میں آپ کی ہمیشہ شکرگزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ مولانا سے کہنا کہ آپ ہی کے نام پر مررہی ہوں مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا.... مولانا کے لیے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

ہچکی آئی اور رخصت ہوگئیں۔

مولانا جیل میں ہوتے تو بستر پر سونا ہی چھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اس مرتبہ دنیا ہی کو چھوڑ دیا۔

○☆○

مولانا کو اپنی اہلیہ کی وفات کی خبر اخبار کے ذریعے ہوئی۔ جنازے میں شرکت کا موقع ملا نہ تیمارداری کا۔ جو بیوی زندگی بھر مرید کی طرح ان کی خدمت کرتی رہی' وہ اس کے آخری کام بھی نہ آسکے کہ آخری وقت میں اسے صورت ہی دکھادیتے۔

قلعہ احمد نگر میں لکھے جانے والے خطوں میں ایک خط کا اضافہ اور ہوگیا۔ انہوں نے اپنے دل کا درد' زلیخا کی یاد کو ایک خط میں منتقل کردیا۔ یہ ایسا خط تھا جسے کہیں پوسٹ نہیں ہونا تھا جو کبھی پوسٹ نہیں ہوسکتا تھا۔

"۱۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ نہ پیش آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کررہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

مولانا ابھی اس صدمے سے گزرے نہیں تھے کہ بھوپال میں ان کی بہن آبرو بیگم رحلت کرگئیں۔ مولانا کو اپنے بچپن کی کئی کہانیاں یاد آکر رہ گئیں۔ وہ کس طرح اس کا خیال رکھتی تھیں' کس طرح اس کے ساتھ کھیلتی تھیں۔ اسے اردو سیکھنے میں مدد دیتی تھیں۔ انہوں نے قلعے کی سنگین دیواروں کو دیکھا اور بے بسی نے آنکھوں کے گوشوں کو بھگودیا۔ اے خدا! ابھی تو صرف ایک سال ہوا اور دو عزیز ہستیاں رخصت ہوگئیں۔ ابھی تو اس قلعے میں مزید رہنا ہے۔ مگر اب عزیز ہستیاں ہیں بھی کون جو رخصت ہوں گی۔

مولانا اور دوسرے اسیروں کو اس قلعے میں رہتے ہوئے تین سال کے قریب ہوچکے تھے۔ جب وہ یہاں آئے تھے تو سخت ترین ایجی ٹیشن ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس ایجی ٹیشن کے زور میں کمی آتی چلی گئی۔ وہ بھی جب یہاں آئے تھے تو تنہائی کا احساس شدت سے ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کے عادی ہوتے چلے گئے بلکہ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ شور ہوتا کیسا ہے؟

۱۹۴۴ء کے آغاز میں جنگ کا پانسا پلٹ چکا تھا اور اتحادیوں کی فتح کے دن قریب لارہا تھا۔ اب وائسرائے ہند کو ان قیدیوں سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا بلکہ یہ نظر آرہا تھا کہ مکمل فتح کے بعد ان کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ مہاتما گاندھی کو خاموشی سے رہا کردیا گیا۔ دوسرے قیدیوں کو ان کے صوبوں کی جیلوں میں پہنچادیا گیا چنانچہ مولانا آزاد کو بنگال کے ایک مقام بنکورہ کی جیل میں پہنچادیا گیا۔

فوجی پہرے سے سول جیل تک منتقلی یہ بتارہی تھی کہ اب رہائی کے دن قریب ہیں۔ ساڑھے تین سال بعد مولانا کسی اعلان کے سننے کے منتظر تھے۔ ان کا قیاس کہہ رہا تھا کہ کوئی اعلان ضرور متوقع ہے۔

آل انڈیا ریڈیو نے سرکاری اعلان نشر کیا کہ کانگریس کے صدر اور ارکان عاملہ کی رہائی کا اعلان کردیا گیا ہے۔ لارڈ ویول کی جانب سے یہ اعلان بھی ہوا کہ ہندوستان کے مسئلے پر حکومت نے شملہ کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ظاہر ہورہا تھا کہ ان سیاسی زعما کو اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ہی رہا کیا جارہا ہے۔

آدھی رات گزر گئی تھی کہ جیلر نے مولانا کو ان کی رہائی کی خبر سنائی۔ رات چونکہ زیادہ ہوگئی تھی اس لیے کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی تھی۔ دوسرے دن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جیل میں آکر کارروائی مکمل کی اور کلکتہ ایکسپریس میں ان کے لیے فرسٹ کلاس کوچ ریزرو کرادیا گیا۔

ان کی رہائی کی خبر ان سے پہلے کلکتہ پہنچ چکی تھی۔ کلکتہ ایکسپریس، کلکتہ پہنچی تو اسٹیشن پر انسانوں کا سمندر موجود تھا۔ مولانا ڈبے سے باہر آئے اور کندھوں پر سوار ہوکر اپنی کار تک پہنچ گئے۔ ان کی کار پھولوں سے چھپ گئی تھی۔ ان کے گلے میں عقیدت کے سیکڑوں ہار پڑے ہوئے تھے۔

وہ اسٹیشن سے سیدھے اپنی اہلیہ کی قبر پر گئے۔ اپنے گلے سے ہار اتار کر بیوی کی قبر پر ڈال دیے۔ اکتالیس سال کی رفاقت مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوکر سامنے پڑی تھی۔ تل کا پہاڑ بھی ہوتا تو اس میں دراڑیں پڑجاتیں، وہ تو پھر انسان تھے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں نے خود بخود رونا شروع کردیا۔

○☆○

اِن دنوں کلکتہ، ایشیا میں امریکی فوج کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مولانا جیسے ہی اپنی رہائی کے بعد کلکتہ پہنچے، امریکی صحافیوں نے انہیں گھیر لیا اور اپنے اضطراب کے پس منظر میں جنگ سے متعلق سوالات کیے۔ ان کا موقف وہی تھا جو ابتدا سے تھا۔ ہم جمہوریتوں سے اشتراک کے خواہاں ہیں لیکن اپنی غلامی کے ہوتے ہوئے کیا مدد کرسکتے ہیں۔

امریکا بذاتِ خود باربار برطانیہ پر زور دے رہا تھا کہ ہندوستان سے اس کی مفاہمت ہی ایشیائی محاذ کی فتح آسان کرسکتی ہے۔ یورپ میں جنگ ختم ہوچکی تھی لیکن ایشیا اسی طرح تپ رہا تھا۔ امریکا کے لیے جاپان کی شکست، جرمنی کی شکست سے زیادہ اہم تھی۔ چاہے یہ ہندوستان کی آزادی کی قیمت پر حاصل ہوتی ہو۔ امریکا ہی کے دباؤ پر وائسرائے لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس منعقد کی۔ کانگریس نے مولانا کو اپنی ترجمانی کا حق دے کر اس کانفرنس میں بھیجا تھا لیکن یہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔

اس دوران میں مولانا آزاد، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کی برابر کوشش کرتے رہے لیکن یہ فاصلے روز بہ روز بڑھتے ہی چلے گئے۔ جب منزل قریب آنے لگتی، کوئی تصادم ان فاصلوں کو بڑھادیتا۔

یہ وقت مولانا کے لیے بہت نازک تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے کانگریسی انہیں شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور مسلم لیگ یا مسلمان انہیں کانگریسی ہونے کی وجہ سے عتاب کا نشانہ بناتے تھے۔

مسلمانوں کو قریب لانے کے لیے انہوں نے بعض تجاویز ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھی تھیں۔ یہ تجاویز اس حد تک مسلمانوں کے حق میں تھیں کہ گاندھی بھڑک اٹھے۔

"مولانا، اگر آپ کا ذہن یہی ہے تو آپ کی جگہ لیگ میں ہے۔ آپ کانگریس سے مستعفی ہوکر لیگ میں چلے جائیں۔"

یہ تھا گاندھی کا رویہ ان کے ساتھ۔ دوسری طرف لیگ انہیں مسلم دشمن سمجھتی تھی۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین..... اردو زبان کی کوئی گالی ایسی نہیں تھی جو ان کے لیے ادا نہ کی گئی ہو۔ علی گڑھ کے طلبہ نے گاڑی روک کر انہیں زدوکوب کیا۔ یہ علم کا پتلا، معمولی طلبہ کے ہاتھوں ذلیل ہوا۔ اس کی کردار کشی کی گئی، اس کے بارے میں طرح طرح کا پروپیگنڈا کیا گیا۔ جیسے جیسے آزادی کا سفر تقسیم کی شکل اختیار کرتا گیا، ان کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی کیونکہ وہ آزادی کے حق میں تھے لیکن "تقسیم" کے شدید مخالف تھے۔ مسلم لیگ ان کے اس نظریے کو اپنی مخالفت سمجھتی تھی اور عام مسلمان، ان کی ہندو نوازی۔

مولانا تقسیم ہند کو نہایت ہولناک خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک، تقسیم ہندوستان کا زیاں تھا اور مسلمانوں کے مسئلے کا حل بھی نہ تھا۔ پاکستان نہ تو سارے مسلمانوں کا گھر ہوسکتا تھا اور نہ پاکستان، ہندوستان بٹوارے کے بعد دوست ہوسکتے تھے۔

سردار پٹیل تقسیم پر تُلے ہوئے تھے اور صاف لفظوں میں کہنے لگے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ رکھنا ناممکن ہے۔ جواہر لعل تقسیم نہیں چاہتے تھے لیکن ان کے نزدیک بھی اب دوسرا حل نہیں تھا۔

اب صرف مہاتما گاندھی تھے جو ان کے ہم خیال نظر آتے تھے۔ وہ بھی تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔ مولانا نے ایک مرتبہ پھر گاندھی سے رجوع کیا اور اپنے خیالات کو دہرایا۔

"اس تقسیم کا آخری نتیجہ مفید نہ ہوگا۔ نفرت بالآخر باہمی جنگ کا سرآغاز ہوگی۔ جو چیز نفرت پر بن رہی ہے اس کے متعلق کوئی مثبت رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا؟"

"مولانا، تم کیوں فکر میں گھل رہے ہو۔ کوئی تقسیم نہیں ہوگی، سوراج ہوگا اور بس۔"

"سردار پٹیل جی جان سے چاہتے ہیں کہ یہ تقسیم

نثرِ آزاد کے چند نمونے

"جو کھونا نہیں جانتے وہ پانے کا مزہ کیونکر لے سکتے ہیں۔ جس نے کبھی کانٹے کی چبھن نہیں دیکھی، وہ تلوار کے زخموں کی روداد کیونکر بتا سکتا ہے۔ دریا میں اُتر کر ہی تیرنا آسکتا ہے۔ تم یہ چاہو کہ پاؤں گیلے نہ ہوں۔ پانی بدن کو چھوئے نہیں اور کناروں پر کھڑے کھڑے تیرنا سیکھ لو تو یہ ممکن نہیں۔ اسلام کی سربلندی کا راز ساحلوں پر کھڑے ہو کر دریاؤں کے پیچ و تاب دیکھنے میں نہیں۔ اس کی سرفرازی کے لیے تمہیں طارق کی طرح اپنی کشتیاں جلانا ہوں گی۔۔۔ کچھ کھو کر ہی کچھ پا سکتے ہو۔۔۔"

"ابھی تاریخ کی صبح طلوع نہ ہوئی تھی کہ ہندوستان میں حلقہ بگوشانِ اسلام گنگا و جمنا کے کناروں پر وضو کرتے نظر آرہے تھے۔ انہی لوگوں کی بدولت اس سرزمین میں اسلام نے اپنے قدم جمائے تھے۔ پھر اس کے میدانوں میں ان شہسواروں ہی نے تاریخ کے شب و روز اجالے تھے۔ آج تم ہو کہ سیاست کی منڈی میں جنس کی طرح پڑے ہو اور تمہیں انتظار ہے کہ بڑی سے بڑی بولی کون دے سکتا ہے؟"

"آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیروں سے کانپتے ہو یاد کرو کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ گھٹاؤں کا طوفان کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ آخر تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے تھے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں لپکیں تو ان پر مسکرائے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر انھی تو رخ پھیر لیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا لوٹ جاؤ۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس طرح غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان نہ تھا۔"

"تاریخ پلٹے کھا رہی ہے۔ وقت کے دامن میں غضب ناک بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اور آشیانوں پر کوندنے کے لیے مضطرب ہیں۔ اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر تیار رکھو۔ اللہ کے قانون تمہارے لیے بدل نہیں سکتے، وہ اٹل ہیں۔ جو لوگ مقصد کے سفر میں ایمان، حق اور صبر کی راہوں سے گزرتے ہیں، ان کے قدم کسی موڑ پر ڈگمگاتے نہیں۔ ان کے لیے کامیابی آگے بڑھ کر اپنے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیتی اور نصرتِ الٰہی معین ہوتی ہے۔"

ہو جائے۔ انہیں کسی نے بتا دیا ہے کہ سرحد، بلوچستان اور آدھا بنگال دے کر پورا ہندوستان مل رہا ہے تو سودا کیا بُرا ہے؟"

"پٹیل تو دیوانہ ہے۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تقسیم میری لاش پر ہوگی اور کانگریس میری لاش پر ہی تقسیم کر سکتی ہے۔"

اس واضح اعلان کے بعد مولانا کو مطمئن ہو ہی جانا چاہیے تھا۔ کانگریس کا سب سے بڑا لیڈر ان کا ہم خیال تھا۔ اب اور کس ضمانت کی ضرورت تھی۔

گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے جا رہے ہیں۔ گاندھی جی کی ملاقات سردار پٹیل سے ہوئی ہے۔ پھر معلوم ہوا گاندھی جی تقسیم پر تیار ہو گئے۔

مولانا بے بس تھے۔ ماؤنٹ بیٹن مقتدر تھا۔ کانگریس ہم نوا تھی۔ پٹیل اور نہرو کے بعد کسی اور کے رد و قبول کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کا تو مطالبہ ہی تقسیم تھا۔ مولانا اپنے گھر میں، اپنوں ہی کے ہاتھوں ہار گئے۔

اس تقسیم پر ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنی رضا مندی دے دی۔ مولانا نے اس تقسیم کو ایک سیاسی حادثے سے تعبیر کیا۔

"پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے اور چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم غائب ہو جاتی ہے۔"

۱۴ اگست کو پاکستان قائم ہو گیا اور پندرہ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا۔ ایک عظیم جشن منایا گیا لیکن مولانا اس جشن میں شریک نہیں ہوئے۔ اس رات وہ سخت غمگین تھے۔ اس لیے بھی کہ ان کے نظریے کی موت ہوئی تھی اور اس لیے بھی کہ اس تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات نہایت اندوہناک تھے۔

مولانا نے کئی سو مسلمان خاندانوں کو اپنی کوٹھی میں پناہ دی۔ محلے محلے گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لیا۔ گاندھی جی کو مجبور کر دیا کہ وہ ان فسادات کے خلاف مرن برت رکھیں۔ گاندھی جی کا مرن برت سردار پٹیل کے لیے سوہانِ روح بن

گیا لیکن اس کی وجہ سے دہلی کی مسموم فضا میں تبدیلی آنے لگی۔

مولانا وہ بدنصیب تھے کہ سخت جدوجہد کے باوجود مسلمان بھی ان سے خفا ہوگئے، کانگریسی زعما بھی مخالف رہے اور فیصلہ بھی ان کی مرضی کے مطابق نہ ہوسکا۔

وہ بددل ضرور ہوگئے تھے لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے وہ مسلمان جنہوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا تھا لیکن پاکستان نہیں جاسکتے تھے، انہیں ہندوؤں کے حوالے کردیا جاتا جبکہ وزیرِ داخلہ کی حیثیت سے سردار پٹیل سخت تعصب کا مظاہرہ کررہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مولانا بڑا سہارا تھے۔ انہیں اپنی ذمے داریاں پوری کرنی تھیں۔ اردو کا مقدمہ بھی لڑنا تھا اور مسلمانوں کے جان ومال کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ ایسی محترم ہستی اور کوئی نہیں تھی جو یہ بار اٹھاسکتی۔

آزاد بھارت میں پہلے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اس کے علاوہ کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کا عہدہ بھی ان کے پاس رہا۔

وہ اگر محض سیاست داں ہوتے تو ممکن تھا، حالات سے سمجھوتا کرلیتے لیکن وہ تو ادیب کا دل رکھتے تھے۔ شدید احساسات کے انسان تھے۔ ایک عصری خطیب، عظیم مفکر اور عالم تھے۔ ایک عمر آزادی کے لیے جدوجہد کی لیکن جب آزادی ملی تو ہندوستان کا نقشہ ان کی منشا کے مطابق نہیں تھا۔ خون کا سمندر ان کے سامنے تھا۔ ان پر تو وہ حادثات بھی عیاں تھے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان تمام حادثات کو اپنے دل پر گزارتے رہے۔ آزادی کے بعد دس سال کی مسافت ان کے لیے جان لیوا ہوگئی۔ انہوں نے وفا کی لیکن وفا کرکے خوش نہ رہ سکے۔

اس رات کابینہ سے فارغ ہوکر آئے تو بشاش تھے۔ کسی مرض کا شائبہ تک نہ تھا۔ حسبِ معمول صبح سویرے اٹھے اور غسل خانے میں گئے۔ ایکا ایکی فالج کا حملہ ہوا۔ جواہر لال نہرو اور رادھا کرشنا منین فوراً پہنچے۔ ڈاکٹروں کی قطار لگ گئی۔ مولانا بے ہوش تھے۔ ۴۸ گھنٹے ان کے لیے خطرے کے تھے۔

آل انڈیا ریڈیو بار بار ان کی علالت کی خبر نشر کررہا تھا۔ اس دن کون تھا جو ریڈیو کے قریب نہ بیٹھا ہو۔ مولانا کے بنگلے میں انسانوں کا ٹھٹ لگا ہوا تھا۔

دو دن بعد ۲۱ فروری ۵۸ء کو موت کا خدشہ یقینی ہوگیا۔ پنڈت نہرو اشکبار چہرے سے اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ ہر چہرہ حزن وملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ شام ہوئی تو ہر امید ٹوٹ گئی۔ عشا کے وقت قرآن خوانی شروع ہوگئی۔ ایک بجے شب سورہ یٰسین کی تلاوت شروع ہوگئی اور ۲۲ فروری کو سوا دو بجے شب مولانا کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا تمام عمر عوام سے کھنچے رہے۔ ان کے جنازے میں عوام کی نہیں خواص کی بھیڑ ہوگی لیکن جنازہ اٹھا تو کنگ ایڈورڈ روڈ کے بنگلے نمبر ۴ کے باہر دو لاکھ سے زیادہ عوام کھڑے تھے اور جب جنازہ انڈیا گیٹ اور پارڈنک برج سے ہوتا ہوا دریاگنج کے علاقے میں پہنچا تو پانچ لاکھ افراد جمع ہوچکے تھے۔

پنڈت جی نے سیکیورٹی افسروں کو دیکھا تو غصے میں گرجے "تم لوگ کیوں مجھے گھیرے ہوئے ہو؟"

"آپ کی حفاظت کے لیے۔"

"کیسی حفاظت۔ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ بچاسکتے تو مولانا کو بچالیتے" یہ کہہ کر وہ بلک بلک کر رونے لگے۔ ان کے اس طرح رونے نے کئی آنکھوں کو اشکبار کردیا۔

مولانا کی بہن آرزو بیگم نے کوٹھی کی چھت سے کہا۔

"اچھا بھائی، خدا حافظ!"

ہندوستان کی پوری کابینہ، غیر ملکی سفیر، ہندوستانی افواج کے تینوں چیف جنازے کے دائیں بائیں تھے۔ پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔ میت لحد کے نزدیک اتاری گئی تو حفاظ قرآن مجید پڑھ رہے تھے، دوسری طرف اکابر وفضلا سر جھکائے کھڑے تھے۔

بری فوج کے ایک ہزار نوجوانوں، ہوائی جہاز کے تین سو جاں بازوں اور بحری فوج کے پانچ سو بہادروں نے اپنے عسکری بانک پن کے ساتھ آخری سلام کیا۔

مولانا سعید احمد دہلوی، صدر جمعیت العلمائے ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر لحد میں اتارا۔ ایک یادگار جسم سفید کھدر کے کفن میں لپٹا ہوا تھا۔

جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان پارک میں ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی تھی۔

مزار کھلا ہے لیکن اس کے اوپر سنگی گنبد کا طرہ ہے اور چاروں طرف پانی کی جدولیں ہیں اور سبزے کی روشیں ہیں۔

اب ان کے مزار سے ملاقات ممکن ہے لیکن مولانا سے ملاقات صبحِ محشر تک موقوف ہوچکی۔

بھلا سکیں گے نہ اہلِ زمانہ صدیوں تک
مری وفا کے مرے فکر و فن کے افسانے